ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ندائے اعتدال

فروری ۲۰۱۵ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	مسلمانوں کے دو فرائض	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	
۲۔	اداریہ	اسلام کو فکر پریشاں نہ بنایا جائے	مدیر	۳
۳۔	خاص تحریر	تیر کتنے ابھی دستِ قاتل میں ہیں	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۳
۴۔	فقہی مباحث	فقہی مسالک کے درمیان جمع وتطبیق	سید سلمان حسینی ندوی	۱۸
۵۔	بحث و تحقیق	مستشرقین اور حدیث	محمد فرید حبیب ندوی	۳۱
۶۔	گوشۂ سیرت	آپ کی نرمی آپ کا ثبات (قسط-۱۳)	تحریر: مسٹراڈیار، مترجم: ایم، اے، جمیل احمد	۳۷
۷۔	// //	امانت کی ادائیگی ہجرت کا اہم پہلو	مفتی تنظیم عالم قاسمی	۳۹
۸۔	اسلامی تعلیمات	حکمت-خدا کی ایک عظیم نعمت	محمد قمر الزماں ندوی	۴۲
۹۔	شخصیات	ڈاکٹر محمود غازی-ایک مطالعہ	محمد طارق ندوی رامپوری	۴۷
۱۰۔	// //	سید حامد ''بڑی مشکل سے ہوتا ہے......''	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۵۶
۱۱۔	استدراک	حضرت سلیمانؑ کی موت سے جن کتنی مدت	محمد فرید حبیب ندوی	۵۹
۱۲۔	آخری صفحہ	دیکھنا پڑتا ہے انداز نگاہِ یار کو	(م-ق-ن)	۶۴
۱۳۔	نعت	ساقی نامہ	ماہر القادری	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

ادار یہ

اسلام کو فکر پریشاں نہ بنایا جائے

اسلام دین برحق ودین محکم ہے،اس کی تعلیمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں،اس دین کا تعلق عملی زندگی سے ہے،اس کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال ہے،اور اعتدال ہی کا نتیجہ ہے کہ دین کے وسیع تصور کو ایک انسان اپنے لیے قابل عمل سمجھتا ہے،دین کے ستر سے زائد شعبے ہیں اور ہر شعبہ کو اس کا حق دینا ہی معتدل فکر ہے،جب دامن اعتدال ہاتھ سے جاتا ہے اور کوئی ایک نقطۂ نظر غالب آتا ہے تو پھر دین ایک عقدہ بن جاتا ہے،اس کو لوگ فکر پریشاں بنا دیتے ہیں،اس کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے کہ خلط مبحث قاری کے لئے خلجان ثابت ہوتا ہے،کسی کام کے مواقع نہ ہونا یا اس کے حالات سازگار نہ ہونا الگ بات ہے لیکن فکر ہی صحیح نہ ہو یا آدمی ذہنی طور پر تیار نہ ہو یہ انتہائی خطرناک ہے،بعض تحریریں نہ جانے کس عالم میں سپرد قلم کی جاتی ہیں انہیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے،کہ یا تو سرسری طور پر لکھ دی گئی ہیں یا پھر سوچ سمجھ کر کسی خاص نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے جس کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں۔

ایک رسالہ کا نو وارد شمارہ ہاتھ میں لیا،اداریہ پر نظر پڑی تو ٹھٹھک کر رک گیا،متعدد جملے بڑے عجیب سے لگے،آپ بھی یہ پیراگراف پڑھیے:

> ”ایک بزرگ سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ فلسطینی لوگ ارض فلسطین کے لئے دشمنوں کے مقابلے میں ایک عرصے سے برسرپیکار ہیں اور اپنے ملک وملت کے لئے کوشش کررہے ہیں،لیکن ابھی تک ناکام ہیں،مگر افغانستان میں طالبان نے کوشش کی،تو وہ بہت جلد کامیاب ہوگئے،اور بڑھتے چلے گئے،تو ان بزرگ نے جواب دیا کہ اہل فلسطین اپنے ملک ووطن کے لئے لڑ رہے ہیں،اس لئے جلدی کامیابی نہیں مل رہی ہے اور طالبان اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے لڑ رہے ہیں،اس لئے ان کو کامیابی مل رہی ہے،اسی طرح ابھی چند دنوں قبل دو بزرگوں کی مجلس میں حاضری ہوئی،وہاں بھی اسی سلسلہ میں گفتگو ہورہی تھی،کہ اسلامی تحریکات آخر کیوں ناکام ہوجاتی ہیں،تو معلوم ہوا کہ ناکامی کی وجہ اصل مقصد سے ہٹنا ہے،اسلام کا مقصد حکومت قائم کرنا نہیں ہے،بلکہ ایک صالح معاشرہ کا وجود ہے،جس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور فرائض کی ادائیگی اصل مقصد ہے،مگر چونکہ اس مقصد پر حکومت کے قیام کا مسئلہ غالب آجاتا ہے،جو مقصود نہیں ہے،اس لئے ناکامی ہوجاتی ہے،

اسلام ایسے معاشرے کا خواہاں ہے، جو فرائض کا پابند ہے، اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ: اگر ہم ان مسلمانوں کو زمین کی حکومت عطا کر دیں، سلطنت عطا کر دیں، تو یہ لوگ نماز ادا کریں گے، زکوۃ دیں گے، اچھائیوں کا حکم کریں گے، برائیوں سے روکیں گے'' اور ایک اچھے معاشرے کو تشکیل دیں گے''۔

اس تحریر کو پڑھنے کے بعد جو تاثرات مرتب ہوئے ان کو قلم بند کرنا ضروری سمجھا گیا،

''فلسطینی اپنے ملک و وطن کے لئے لڑ رہے ہیں، اس لیے جلدی کامیابی نہیں مل رہی ہے''

بزرگ کوئی بھی ہوں ان کے حوالے سے یہ بات نقل کرنا انتہائی غلط ہے، اس لیے کہ یہ حرف غلط، فکر غلط اور نقل غلط ہے، یہ جملہ مسئلہ سے بالکل عدم واقفیت کی دلیل ہے، فلسطینی اپنے وطن کے لئے لڑ رہے ہیں تو بھی یہ عین جہاد ہے، کس وطن کے لئے لڑ رہے ہیں، ارض مقدس کے لئے، فلسطین کے لئے، قبلۂ اولیٰ کے لئے، ملت اسلامیہ کی عزت کی علامت کے لئے، اس لیے یہ افضل ترین جہاد ہے، حضور پاک علیہ السلام نے ایک روایت میں ارشاد فرمایا: ولا تزال من امتی امة یقاتلون علی الحق...... جامع الأصول/ج ۲/ص ۳۳۸/کتاب الجهاد مكتب البحوث والدراسات فی دار الفکر بیروت، لبنان. کہ میری امت کا ایک گروہ برابر حق کے ساتھ اور حق کے لئے برسر پیکار رہے گا، مجاہدین کی دیگر جماعتوں کے سلسلہ میں تو لوگوں کے نقطۂ نظر مختلف ہیں، لیکن تقریبا باوجود اختلاف مسلک و مشرب بلکہ مذہب اس پر سب کا اتفاق ہے کہ موجودہ دور میں اس حدیث کا مصداق فلسطین کا جہاد ہی ہے، جس کا سودا کرسی کی حفاظت کے لیے زرسیال سے دنیا کو شکار کرنے والوں نے کیا تھا اور جو اپنے تمام تر نفاق کے باوجود فلسطینی جہاد کو دہشت گردی کا نام نہیں دے پائے ہاں مجاہدین کو ضرور یہ نام دے دیا، ان ہی منافقوں کی سازش کا نتیجہ ہے کہ اہل فلسطین آج تک کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں، مذکورہ بالا جملہ مطالعہ قرآن سے صحیح تعلق یا حالات سے صحیح واقفیت نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے ورنہ قرآن کریم نے منافقین کے جو کردار بیان کیے ہیں، ان کی سازشوں کی جس طرح پول کھولی ہے اس کے تناظر میں اگر حالات کا جائزہ لیا جاتا تو یہی زبان زد ہوتا کہ ۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مفکر اسلام مولانا علی میاںؒ نے پوری توانائی اس پر صرف کر دی کہ قضیہ فلسطین ایک اسلامی ہی نہیں انسانی مسئلہ ہے چہ جائیکہ اس مسئلہ پر اپنی جان نچھاور کرنے والوں کو یہ الزام دیا جائے کہ وہ اپنے ملک کے لڑ رہے ہیں اس لیے جلدی کامیابی نہیں مل رہی ہے، کس کو نہیں معلوم کہ جب اخوانی مجاہدین تل ابیب کو فتح کرنے سے ایک یا دو دن دور رہ گئے تھے تو منافقین کی سازش نے انہیں خون کے آنسو رونے پر مجبور کیا، کس پر اب تک یہ راز عیاں نہیں ہوا کہ مصر کی اخوانی حکومت کو

منافقین نے محض اسرائیل کے استحکام وتحفظ کے لئے مٹی میں ملا دیا، افسوس کہ وحی کا سلسلہ نہیں رہا ورنہ شاید اس طرح کی باتیں کرنے والے منافقین کی سازشوں کا یقین کر لیتے، کیوں کہ وحی کے ذریعہ ہی اللہ تعالیٰ منافقین کو ذلیل کیا کرتے تھے أولا یرون انهم یفتنون فی کل عام مرة أو مرتین ثم لا یتوبون ولا هم یذکرون (توبہ ۱۲۶) (ترجمہ: کیا یہ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ ان کی آزمائش ہوتی ہے، پھر بھی یہ توبہ نہیں کرتے اور نہ ہوش میں آتے ہیں) یفتنون کے ضمن میں مفسرین کی صراحتیں موجود ہیں کہ اس سے منافقین کا جنگ میں مبتلا ہونا، ان کے حلیفوں کی شکست اور ان کی سازشوں کی قلعی کھلنا ہے، جو فلسطینی وہاں سے مجبور ہو کر دیگر ممالک میں زندگی گزار رہے ہیں وہ بھی ہر آن قضیہ فلسطین کے لئے حتی المقدور کوشاں و پریشاں ہیں، جب ضرورت اس کی ہے کہ ہر ہر بچہ کو قضیہ فلسطین کی اہمیت وحساسیت سے واقف کرایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ قبلہ اولیٰ پر صہیونی تسلط ملت اسلامیہ کی ذلت اور اس کی آزادی ملت کی عظمت کی علامت ہے تو ایسے وقت میں اس طرح کی تحریریں وجود میں آتی ہیں جو اس قضیہ کو کمزور کرنے اور اہمیت کو کم کرنے کے علاوہ اور کیا کریں گی۔

''اور طالبان اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے لڑ رہے اس لیے ان کو جلد کامیابی مل رہی ہے''

اب کیا کہا جائے جبکہ وہ ظاہری طور پر ناکام ہو گئے کیا ان کا مقصد بھی محض حکومت تھا؟؟، یا پھر ان کی نیتیں بھی خالص نہ تھیں؟؟ ان حساس موضوعات پر ایسی سرسری گفتگو الجھنیں پیدا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی ہیں، یہ بات لکھنے سے پہلے بہت سے سوالات ہیں، طالبان کون تھے؟ کہاں سے آئے؟ کیسے کھڑے ہوئے؟ اسباب کامیابی کیا تھے؟ پھر ناکام کیوں ہو گئے؟ موجودہ صورت حال میں ان کا کردار کیا ہے؟ اگر اسلامی تحریکات کی ناکامی پر گفتگو کرنا ہے تو اس پر سب سے خاموش، اطمینان بخش تبصرہ بھی قرآن کی زبان میں کر لیجئے جس پر کوئی گرفت بھی نہیں ہوگی، مطالعہ بھی نہیں کرنا پڑے گا، سوچنے اور تجزیہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی، قرآن کریم نے منافقین کو جواب دیتے ہوئے کہا ہے قل لن یصیبنا الا ما کتب الله لنا هو مولٰنا وعلی الله فلیتوکل المومنون، قل هل تربصون بنا الا احدی الحسنیین ونحن نتربص بکم أن یصیبکم الله بعذاب من عنده أو بایدینا فتربصوا انا معکم متربصون (توبہ ۵۱-۵۲) (ترجمہ: کہہ دیجئے کہ ہمارے ساتھ وہی ہوتا ہے جو اللہ کا لکھا ہے، جو ہماری تقدیر میں ہے، اللہ ہی ہمارا سرپرست اور کارساز ہے، اور اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے، ان سے کہیے کہ کیا تم ہمارے بارے میں دو نعمتوں میں سے ایک نعمت کے منتظر ہو (فتح کے یا شہادت کے)، اور ہم تمہارے بارے میں اس کے منتظر ہیں کہ اللہ اپنے پاس سے تمہیں عذاب دے گا، یا ہمارے ہاتھوں دلوائے گا، تو انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں)

اس کے بعد کی جو تحریر ہے اس کے متعلق یہ وضاحت ضروری ہے کہ یقیناً حکومت کا قیام اسلام کا مقصد نہیں لیکن یہ بھی درست نہیں کہ اس کی نفی اس طرح کی جائے گویا وہ ایک بے مقصد چیز ہے، سیدھی اور سچی بات یہ ہے کہ اس کے بغیر قرآن وسنت کے ایک بڑے حصہ پر عمل متروک ہے، جن ممالک کو یہ قوت حاصل ہے کہ وہ متروک احکامات پر عمل کر سکیں ان پر تو عمل واجب ہے لیکن جن جگہوں پر اس کا موقع نہیں وہاں بھی اس کی کوشش بہر حال مطلوب ہے اگر چہ اس کے نہ ہونے پر کوئی گرفت نہیں، حکومت کا قیام اگر چہ مقصود لذاتہ نہیں بلکہ مقصود لغیرہ ہے، لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ وہ مقصد اصلی نہ ہو کر بھی کس حد تک ضروری ہے کہ اس کے بغیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی بھی پورے طور پر ممکن نہیں ہے، امام نووی جو ساتویں صدی کے ہیں لکھتے ہیں اعلم ان الامر بالمعروف والنھی عن المنکر قد ضیع اکثرہ من أزمان متطاولة ولم یبق منہ فی ھذہ الأزمان الا رسوم قلیلة جدا، وھو باب عظیم بہ قوام الامر وملاکہ، واذا کثر الخبث عم العقاب الصالح والطالح واذا لم یاخذوا علی ید الظالم اوشك ان یعمھم اللہ تعالیٰ بعقابہ "فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنة أو یصیبھم عذاب الیم" (نضرة النعیم ر ج ۳ ر ص ۵۲۶ ر الأمر بالمعروف والنھی عن المنکر ر الطبعة الثامنة ۲۰۱۲ ر دار الوسیلة للنشر والتوزیع) (ترجمہ: یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنے سے ایک طویل زمانہ سے غفلت برتی گئی، یہاں تک کہ آج امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام پر کچھ رمزی چیزیں باقی رہ گئی ہیں، حالانکہ یہ ایک عظیم عمل ہے جس پر دین کا دارومدار ہے، جب برائی بڑھ جاتی ہے تو سزا نیک و بد پر عام ہو جاتی ہے، جب ظالموں کے ہاتھوں کو نہ پکڑا جائے تو کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب پر اپنی سزا کو عام کر دے، تو ان لوگوں کو جو ان کے حکم کے خلاف کرتے ہیں ڈرنا چاہیے، کہ کہیں وہ کسی سخت آزمائش میں نہ پڑ جائیں، یا انہیں دردناک سزا ملے)

امام نووی کی اس عبارت میں دو باتیں قابل غور ہیں ایک تو یہ کہ وہ اپنے زمانے کے سلسلہ میں لکھ رہے ہیں کہ اُس زمانے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی چند شکلیں ہی رہ گئی تھیں، اندازہ کیجئے اس موجودہ صدی کے مسائل اور ان کے ساتھ کے ساتھ اوامر کے ترک اور مناہی کے ارتکاب کا، اور جائزہ کیجئے اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے مروجہ شکلوں کا، دوسری بات یہ کہ انہوں نے ظالم کا ہاتھ پکڑنے کو بھی اسی فریضہ میں رکھا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ کام بغیر حکومت وطاقت کے ممکن نہیں، پھر اگر خباثتیں، رذالتیں اور فواحش ومنکرات کے ساتھ ظلم عام ہوگا جیسے آج ہے اور اس کے روک ٹوک کا سامان نہیں کیا جائے گا تو ان کا قرآنی استدلال بھی بہت خوب و برمحل ہے اور موجودہ صورت حال اس کی تفسیر ہے فلیحذر الذین یخالفون عن أمرہ ان تصیبھم فتنة أو یصیبھم عذاب ألیم (نور:۶۳)

(ان لوگوں کو جوان کے حکم کے خلاف کرتے ہیں ڈرنا چاہیے کہ کہیں وہ کسی سخت آزمائش میں نہ پڑ جائیں، یا انہیں دردناک سزا ملے)

مدت دراز سے جہاد اور حصول اقتدار کی کوشش متروک ہے، جو لوگ اس کے لیے کوشاں ہیں وہ بھی فکر غلط کے حامل قرار دیے جاتے ہیں، ۷۰-۲۷ سال کی مختلف النوع کوششوں اور افراد سازی کی مثال قائم کر دینے کے بعد اگر اس کی کوشش کی جائے تو بھی مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے، یقیناً بات یہی ہے کہ اصلاح معاشرہ اصل مقصد ہے لیکن کس کا مقصد ہے؟ اسلامی حکومت کا مقصد ہے: الذین ان مکناھم فی الأرض أقاموا الصلوۃ و آتوالزکوۃ وامرو بالمعروف ونھوا عن المنکر ولله عاقبة الأمور (سورہ حج:۴۱) (ترجمہ: (حقیقی اہل ایمان وہ ہیں) جن کو جب ہم زمین میں اقتدار دیتے ہیں تو وہ نمازیں قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں، اور بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں، اور تمام معاملات کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔)

مفسرین نے صاف لکھا ہے کہ یہ آیت ہجرت مدینہ کے فوراً بعد نازل ہوئی ہے، اس وقت مسلمانوں کو کہیں بھی اقتدار حاصل نہیں تھا گویا یہ اقتدار کی بشارت وخبر تھی اور اس کا مقصد پہلے ہی طے کر دیا گیا تھا، گویا حکومت قائم ہوگی، کرنی پڑے گی اور وہ قائم ہوئی، مفسرین نے خلفائے راشدین اور ان کی حکومت کو اس آیت کی بشارت کا مصداق قرار دیا، اب اس سے یہ استدلال کیسے صحیح ہے کہ اصلاح معاشرہ ہی اصل مقصد ہے حکومت مقصدِ اصلی نہیں، حضرت ضحاک نے اس آیت کو آئندہ حکومت وسلطنت پانے والوں کے لئے بھی ہدایت قرار دیا ہے، اس کے بعد یہ بھی غور کرنے کی ضرورت ہے قرآن نے یہاں جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ امر ونہی کے الفاظ ہیں اس سلسلہ میں ہم مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اقتباس نقل کرتے ہیں جو نہ صرف اس آیت کی بہترین تشریح بلکہ اقتدار واصلاح کے مسئلہ میں فکر معتدل کا ترجمان و شارح ہے، اور جس سے واضح ہوتا ہے کہ مکمل طور پر اسلامی معاشرے کی تشکیل بغیر اسلامی حکومت کے ممکن ہی نہیں، موجودہ متنوع کوششوں سے کتنے فیصد معاشرہ کی اصلاح ہو چکی ہے؟ یہ ایک خطرناک سوال ہے اور اس کا جواب بہت حیرت انگیز ہے، مولانا فرماتے ہیں:

> ''اگرچہ میرا تعلق فطری طور پر خاندانی طور پر اس مکتب فکر اور اس گروہ سے ہے جو خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات پر وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہے، میری مراد سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اولوالعزم، عالی ہمت رفقاء سے ہے جنہوں نے احیائے خلافت اسلامیہ کی کوشش کی اور ان پچھلی صدیوں میں پورے عالم اسلام میں کسی ایسی جامع مکمل، بلند نظر، بلند ہمت جماعت کا سراغ

نہیں لگتا جیسا کہ حضرت سید صاحبؒ کی جماعت تھی، میرا تعلق اس جماعت سے ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے مسلمانوں کو حریت کی فضاء کی ضرورت ہے اور خدا کا یہ فرمان جس طرح نزول کے وقت صحیح تھا، آج بھی صحیح ہے اور قیامت تک صحیح ہوگا۔

الذین ان مکنّٰھم فی لأرض اقاموا الصلوٰۃ واٰتو الزکوٰۃ وامروا با المعروف ونھوا عن المنکر (الحج ۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں۔

آپ خیال کیجئے کہ معروف ومنکر کے لئے قرآن مجید میں اور حدیث میں امر ونہی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، استدعا و درخواست کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔ عربی زبان ایسی تنگ دامن نہیں ہے کہ اس کے اندر صرف امر ونہی کے الفاظ ہوں اور دوسرے الفاظ نہ ہوں، جن میں تواضع ہے، خوشامد ہے، جن میں استدعا ہے، جن میں مطالبہ ہے، بلکہ اس کے لئے جہاں کہیں بھی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ امر اور نہی کے ہیں۔ ''تأمرون با لمعروف و تنھون عن المنکر''، ''کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأ مرون بالمعروف و تنھون عن المنکر'' اور امر ونہی طاقت چاہتے ہیں۔ امر ونہی وہ مقام چاہتے ہیں جہاں سے ہم اعتماد کے ساتھ اور جرأت کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ امر میں اور نہی میں ایک استعلاء ہے۔ امر ونہی درخواست کے معنی میں نہیں، امر ونہی حکم دینا اور روکنا، اس کے لئے آدمی کے اندر قوت چاہئے، ایسا مقام اور ایسی بلندی چاہئے، ایسا اعتماد چاہئے اور اس کی ایسی وقعت ہو دلوں میں کہ وہ امر کر سکے نہی کر سکے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو قوت کی ضرورت ہے، اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے کہ ہمیشہ وہ یہی نہ کہے کہ ''اگر ایسا کر لیا جاتا تو اچھا تھا'' ہماری درخواست ہے اور ہم آپ کو ترغیب دیتے ہیں ''ہم تبلیغ کرتے ہیں''۔ اپنی جگہ پر یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن قرآن جو معیار ومیزان ہے اس میں الفاظ امر ونہی کے ہیں، جن میں مسلمانوں کو وہ طاقت حاصل کرنی چاہئے کہ جس مقام پر فائز ہو کر وہ حکم دے سکیں اور روک سکیں، اس لئے کہ فطرت انسانی تعریف تو کر دیتی ہے اور وہ خوش بھی ہو جاتی ہے، لیکن انسانی نسل کی پوری اصلاح مکمل اصلاح کے بغیر نہیں ہو سکتی جس کے نتیجے میں أقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ اور أمر با لمعروف اور نھی عن المنکر کے الفاظ آئے ہیں''۔ (خطبات علی میاں ج۔۴ص،۲۸۲۔۲۸۳)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حصول اقتدار مقصد اصلی تو نہیں مگر اس کی کوشش واجب ہے اور اس کی کوشش

یہی ہے کہ اصلاح معاشرہ کی تحریک اس طرح چلائی جائے اور صالح معاشرے کی تشکیل اس طور پر کی جائے کہ اس میں اسلام کے وسیع تصور کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو، وہ شریعت کے مکمل نفاذ کو قبول کر سکے، وہ اسلامی حکومت کا مطالبہ کر سکے، اس معاشرے میں ایسے علماء وفقہاء وجود میں آئیں جو مسلم حکام کا ترک جہاد پر محاسبہ کر سکیں، قرآن وسنت کے متروک حصہ پر عمل کا مطالبہ کر سکیں، سوچیے! ذرا ان باتوں میں کیا دم ہے کہ اس وقت مسلمان اس پوزیشن میں نہیں اور حالات ایسے نہیں اور ویسے نہیں قرآن نے جس وقت مسلمانوں سے ایک اکائی بننے اور جمعیت بن جانے اور کفر کے خلاف متحد ہونے کا مطالبہ کیا اس وقت ان کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زائد نہ تھی، وإن انتصروكم في الدين فعليكم النصر إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق والله بما تعلمون بصير والذين كفروا بعضهم أولياء بعض إلا تفعلوه تكن فتنة في الأرض وفساد كبير (انفال:۷۲-۷۳)(ترجمہ: وہ اگر تم سے دین کے لئے مدد کے طلبگار ہیں تو تمہیں ان کی مدد کرنا چاہیے، سوائے اس صورت کے کہ ان لوگوں کے خلاف مدد طلب کی جا رہی ہو جن کے اور تمہارے درمیان کوئی عاہدہ ہے، اور اللہ تمہاری کاروائیوں سے خوب آگاہ ہے، اور جو کافر ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے کے حلیف ہیں، اور تم اگر مظلوموں کی نصرت کی کاروائی نہیں کروگے، تو زمین میں بڑا فتنہ اور فساد ہوگا۔)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کامیابی کا انحصار اسی معاشرے پر اور اس کے پسند و ناپسند کے پیمانے پر ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کی پسند کے معیار کو بدلا جائے اور اس کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کی جائے، اس کے وسیع تصور کو اس پر واضح کیا جائے، نہ کہ ایسی فکریں عام کی جائیں جو گوشۂ عافیت کی طرف رہنمائی کرتی ہوں یا جن کے سبب اسلام کا ایک بڑا حصہ توجہ کا مرکز ہی نہ بننے پائے، علماء کی صف سے معاشرے کو یہ ہدایت دی جانی چاہیے کہ مسلم دنیا کے حکمرانوں سے مطالبہ کریں کہ قرآن کے اس حکم پر عمل کیوں نہیں وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله، فإن انتهوا فلا عدوان إلا على الظالمين (بقرہ:۱۹۳)(ترجمہ: ان سے اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک ''فتنہ'' (دین کے خلاف ان کی مہم) ختم نہ ہو، اور اطاعت وفرمانبرداری صرف اللہ کی ہو، پس اگر وہ باز آجاتے ہیں تو کوئی زیادتی نہیں ہوگی، ہاں ظالموں کو جواب دیا جائے گا۔)، اور معاشرہ ان سے سوال کر سکے کہ آپ کفار ومشرکین کے تلوے کیوں چاٹتے ہیں، ان کے دست نگر کیوں بنے ہیں، انہیں جگہ دے کر حجاز مقدس کو کیوں گندا کر دیا ہے، جزیرۃ العرب میں غیروں کی عبادت گاہیں کیوں تعمیر کر دی ہیں، آپ ہر جگہ گڑگڑاتے کیوں نظر آتے ہیں جبکہ حکم یہ ملا تھا کہ کفار آپ کے سخت موقف کو محسوس کریں، يا أيها الذين آمنوا قاتلوا الذين يلونكم من الكفار وليجدوا فيكم غلظة واعلموا أن الله مع المتقين (توبہ:۱۲۳)(ترجمہ: اے ایمان والو! جو کافر تمہارے آس پاس کے

علاقوں میں ہیں (اور فتنوں میں ملوث ہیں) ان سے جنگ کرو، اور وہ تمہارا سخت موقف محسوس کریں، اور جان لو کہ اللہ متقیوں اور پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

یہ بات بہر حال یادرکھنی چاہیے کہ اس طرح کے افکار فریضۂ جہاد کے متروک ہونے سے عام ہوئے، اس کی مختلف تاویلیں کی جانے لگیں، ورنہ فکری تربیت اور ذہنی تیاری بہر حال مطلوب ہے، ورنہ جہاد کے بارے میں ارشاد رسول ہے الجهاد ماض الى يوم القيامة، (ترجمہ: اور جہاد تو تا قیامت جاری رہے گا) اس کی اقسام ہیں، نوعیتیں ہیں، مواقع ہیں، مقاصد ہیں لیکن اس سے مفر نہیں، اسی جہاد کے سبب حکومت قائم ہوتی ہے، اصلاح ہوتی ہے، وہ بقاء و عزت کا سبب اور عزت وعظمت کی علامت اور صدق ایمان کی دلیل ہے، اسی میں اسلام کی عزت وسربلندی اور کفار کی پستی وتابعداری مقدر ہے، تمکین فی الارض کا یہی ذریعہ ہے اور اسی تمکین کے ذریعہ طاغوت وشیطان کی حکمرانی کو لگام دی جاسکتی ہے، ہر شخص کو اس کا متمنی ہونا چاہیے اور اپنے رب سے شہادت کی دعا کرنی چاہیے۔

اس پہلو پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ تقریبا ۷۵ سالوں سے ایک صالح اسلامی معاشرے کی تشکیل کی بات کی جا رہی ہے، کیا وہ وجود میں آ گیا؟ کیا اسلام کے احکامات مکمل طور پر نافذ ہوگئے؟ کیا قبلۂ اولیٰ آزاد ہے؟ کیا لوگوں کی اخلاقی حالت درست ہوگئی؟ کیا معاملات کی دنیا میں اسلام کا چلن ہے؟ یقیناً جواب نفی میں ہے اور جہاں ان سوالوں کے جواب میں کچھ مثبت رمق ہے اس کا سبب بھی شریعت پر عمل ہے، خواہ یہ عمل انفرادی ہو یا کسی درجہ میں شریعت کا اجتماعی نفاذ ہو، مکمل عمل کے لئے بہر حال خلافت وحکومت کے قیام کی کوشش باقی رہ جاتی ہے اور ہمارے علماء نے اس کو ہمیشہ پیش نظر بھی رکھا ہے، ان پر خوب واضح رہا ہے کہ یہ ان کے فرض منصبی کا تقاضہ اور ان کے وجود کی علامت اور ان کی سیاسی ضرورت ہے، اسی لیے دور آخر میں جب عثمانی خلافت کو جبرا اور سازشاً اکھاڑ پھینکا گیا تو ہمارے علماء نے احیاء خلافت کی تحریک چلائی، فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی رحمہ اللہ نے مکہ میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں اس دور کے مشاہیر بشمول مولانا محمد علی جوہر شریک ہوئے، اس کانفرنس نے یہ ثابت کیا کہ خلافت نہ صرف ملت کی ضرورت ہے بلکہ اس کے بغیر ملت ایک جسم بے جان ہے۔ یہ بات ہمیشہ یادرکھنی چاہیے کہ خلافت وحکومت کا قیام اگر چہ مقصود لغیرہ ہے لیکن اسے مقصود لغیرہ سمجھ کر اس کی کوشش کو چھوڑا نہیں جاسکتا کہ اس کے بغیر دین کے نہ جانے کتنے مقصود لذاتہ اوامر کی تعمیل ممکن نہیں۔

موجودہ دور کی تمام تر اصلاحی کوششوں کے باوجود ملت اسلامیہ کی ذلت ونکبت کے منجملہ تمام اسباب کے ساتھ اس حقیقت کی طرف نظر کیوں نہیں جاتی کہ حضور پاک ﷺ نے صاف فرمایا کہ اذا تبايعتم بالعينة وأخذتم اذناب البقر ورضيتم بالزرع وتركتم الجهاد، سلط الله عليكم ذلالا ينزعه حتى ترجعوا إلى

دینکم (ترجمہ: جب تم بیع العینۃ کرنے لگو گے (بیع العینۃ ایک خاص قسم کی بیع ہے جس میں سود کا حلیہ پایا جاتا ہے) اور تم جہاد کو چھوڑ دو گے، تو اللہ تمہارے اوپر ذلت کو مسلط کر دیا، وہ اس ذلت کو نہیں ہٹائے گا، یہاں تک کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ) جامع الأصول رج ۹رص ۶۳۶ کتاب اللواحق، ۲۰۸، مکتب البحوث والدراسات فی دار الفکر بیروت، لبنان۔

لیکن گوشۂ عافیت کی زندگی، نرم بستروں کی نیند اور اونچی و آرام دہ کرسیوں پر وعظ کی عادت اس حقیقت کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی حالانکہ حقیقت یہی ہے کہ ترک جہاد اور اس کی متعدد تاویلوں نے ہی امت کا یہ برا حال کیا ہے، امام شوکانی اسی حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں .... ذلت کا سبب تو اللہ بہتر جانتا ہے لیکن جب کے لوگوں نے اللہ کے راستہ میں جہاد کو چھوڑ دیا جس میں اسلام کی عزت اور تمام ادیان کے اوپر اس کا غلبہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ برعکس معاملہ فرمایا اور وہ ان کے اوپر ذلت کا تھوپ دینا ہے۔

جبکہ صالح المنجد نے مزید صراحت کے ساتھ یہ بات فرمائی۔

اس حدیث کے اندر اللہ کے راستہ میں جہاد کی زبردست تاکید ہے، اور اس کا چھوڑنا تمام اقوام کے سامنے اس امت کی ذلت کا سبب ہے، اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آج حقیقت میں امت کا یہی حال ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو اس دین کی طرف لوٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بات بالکل واضح ہے صرف سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قیام حکومت مقصود اصلی نہیں لیکن بہت سے واجبات کی تکمیل کے لئے اس کا قیام واجب ضرور ہے، اس لیے ضروری ہے کہ صحیح اور معتدل فکر کی ترجمانی کی جائے اور اگر عملا نہ صحیح تو زبان و قلم کے ذریعہ ایسے افراد کی ذہنی و فکری تشکیل کی جائے جو اس کام کو انجام دے سکیں، آج عالم اسلام میں جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ بیسویں صدی کے متعدد مفکرین کے ذریعہ کی گئی قلمی و اصلاحی و فکری کوششوں کا ثمرہ ہیں، امام حسن البنا اور سید قطب ہوں یا مولانا مودودی و مفکر اسلام مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہم، سب نے مکمل اسلامی نظام کے قیام کی اپنی بساط بھر کوشش کی ہے، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین آخر کس مرض کی دوا ہے؟ اس کو پڑھ کر کیا داعیہ پیدا ہوتا ہے؟ اس کا کیا پیغام ہے یہ اس کتاب کو پڑھنے والے خوب جانتے ہیں، جنہوں نے نہیں پڑھا ہے انہیں ذرا غور سے پڑھنا چاہیے اس کتاب میں موجود فکر کو اپنے اوپر مسلط کرنا چاہیے، یہ کتاب اسلام کے وسیع تصور کو پیش کرتی ہے اور ایک مکمل اسلامی نظام کے سایہ میں قیام امن کی نوید دیتی ہے، اس سلسلۂ گفتگو کو ختم کرتے ہوئے مفکر اسلام کے اس رہنما اقتباس کو اور پڑھ لیجئے جو ''شہدائے بالاکوٹ کے مقام و پیغام'' کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔

''یوں تو شہدائے بالاکوٹ میں سے ہر فرد کا پیغام یہ ہے کہ ﴿یا لیت قومی یعلمون، بما

غفر لی ربی وجعلنی من المکرمین﴾(یٰس:۲۶۔۲۷) گرگوش شنوااور دیدۂ بینا کے لئے ان کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ ہم ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کے لئے جد جہد کرتے رہے، جہاں ہم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکیں، جہاں ہم دنیا کو اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کا نمونہ دکھا کر اسلام کی طرف مائل اور اس کی صداقت وعظمت کا قائل کرسکیں، جہاں نفس وشیطان ،حاکم وسلطان اور رسم ورواج کے بجائے خالص اللہ کی حکومت واطاعت ہو ﴿ویکون الدین کلہ للہ﴾(الانفال:۳۹) جہاں طاعت وعبادت اور اصلاح وتقویٰ کے لئے اللہ کی زمین وسیع اور فضا سازگار ہو ،اور فسق وفجور ومعصیت کے لئے زمین تنگ اور فضا ناسازگار ہو، جہاں ہم کو صدیاں گذر جانے کے بعد پھر ﴿الذین ان مکنٰھم فی الارض أقامو االصلوٰۃ وآتو الزکوٰۃ وأمروا با لمعروف ونھو ا عن المنکر﴾(الحج:۴۱) کی تفسیر اور تصویر پیش کرنے کا موقع مل سکے،تقدیر الٰہی نے ہمارے لئے اس سعادت ومسرت اور اس کی آرزو کی تکمیل کے مقابلے میں جنگ کی شہادت اور اپنے قرب ورضا کی دولت کو ترجیح دی، ہم اپنے رب کے اس فیصلہ پر رضا مند وخورسند ہیں،اب اگر اللہ تعالی نے تم کو دنیا کے کسی حصہ میں کوئی خطۂ زمین عطا فرمایا، جہاں تم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکو،اور اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرہ کے قائم کرنے میں کوئی مجبوری مخل اور کوئی بیرونی طاقت حائل نہ ہو، پھر بھی تم اس سے گریز کرو،اور ان شرائط واوصاف کا ثبوت نہ دو، جو مہاجرین ومظلومین کے اقتدار اور سلطنت کا تمغۂ امتیاز ہیں تو تم ایسے کفران نعمت اور ایک ایسی بدعہدی کے مرتکب ہوگئے، جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔‘‘(جب ایمان کی باد بہاری چلی:ص۔۲۹۱ تا ۲۹۳)

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

خاص تحریر

''تیر کتنے ابھی دست قاتل میں ہیں''

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

یہ نئے سال کے لئے نئی تحریر ہے، ہندوستان کے مختلف اخبارات میں راقم سطور کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں، کتابیں بھی منظر عام پر آتی رہتی ہیں، لوگ خوش فہمی میں خوش اعتقادی میں مفکر ادیب انشاء پرداز اور نہ جانے کیا کیا کہہ دیتے ہیں، بقول شاعر ''کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا'' مجھے اپنے بارے میں کبھی خوش گمانی نہیں رہی۔ من آنم کہ من دانم۔ لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میری تحریریں لامقصدیت کے عیب سے پاک ہوتی ہیں۔ مقصد ایک ہی رہتا ہے اور وہ ہے ''سوئے قطارمی کشم ناقہ بے زمام را'' ذاتی مطالعہ کے لئے بھی انتخاب ان ہی تحریروں کا ہوتا ہے جو سنجیدہ ہوں، فکر انگیز ہوں اور مقصدیت کی حامل ہوں یعنی ایسی تحریریں جو ناقہ بے زمام کو سوئے قطار اور بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لانے کے لئے لکھی جاتی ہیں، باقی دوسری نگارشات تو کبھی خوش وقت اور دلشاد ہونے کے لئے ٹک دیکھ لی اور پڑھ لی جاتی ہیں۔ میں اپنی تحریروں کا جائزہ لیتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ میرے نصیب میں صرف نوحہ گری اور مرثیہ خوانی آئی ہے، کبھی فلسطین کا کوہ غم، کبھی شام کا سوز الم، کبھی مصر کا ماتم، کبھی جرم ضعیفی کا رونا اور کبھی افغانستان اور عراق میں قتل عام پر اشک فشاں ہونا، کبھی ایک ملک میں مسلمان کے سروں کی فصل کٹتی ہے اور کبھی دوسرے ملک میں سر بریدہ لوگوں کی قطار لگ جاتی ہے، کبھی کبھی ستارۂ امید روشن ہوتا ہے، تو قلم سے ''حالات بدل سکتے ہیں'' جیسی تحریر منظر عام پر آتی ہے اور پھر جب امید کے چراغ کی لو کم ہوتی ہے تو ''دے مجھ کو زبان اور'' جیسی کتاب لوگوں کے سامنے آتی ہے، لیکن حال یہ ہے کہ صبح زندگی اب شام زندگی سے آکر مل گئی ہے، نہ ملت کے المیئے کم ہوئے اور نہ مسلمانوں کی مشکلات ومصائب میں کمی واقع ہوئی، بس حالات کی الم انگیزی کا درجہ حرارت کم ہوتا اور بڑھتا رہا، اور مسلمانوں کی سیاہ بختی پر نوحہ گری کا سلسلہ بلا انقطاع جاری رہتا ہے، ہر نیا سال جب نیا سورج لے کر طلوع ہوتا ہے تو ذلت وہزیمت اور بے آبروئی کی نئی داستان سامنے آجاتی ہے، نہ تو نخل امید پورے طور پر برومند ہو پاتا ہے اور نہ تباہی اور بربادی کی سیاہ رات ختم ہونے کو آتی ہے، یہ معاملات ایک

دن یا دو دن کے نہیں ہیں بلکہ صدیوں کے ہیں۔ زخم ہے کہ ہمیشہ ہرا رہتا ہے۔

ایک زخم بہت پہلے لگا تھا۔ یکم مئی ۷۱۲ عیسوی کو طارق بن زیاد نے اندلس فتح کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی اس میں اس نے اسلامی لشکر سے تمام کشتیاں جلانے کے بعد کہا تھا کہ ’’**البحر من وراء کم والعدو امامکم** ‘‘ تمہارے پیچھے سمندر اور آگے دشمن ہیں۔ اندلس فتح ہوا پھر تاریخ نے ایک نیا ورق الٹا۔ ۲۲ ستمبر ۱۶۰۹ کو جب ویلنیا کے عیسائی بادشاہ کے حکم پر اندلس سے مسلمانوں کا تخلیہ ہوا تو دشمن پیچھے اور سمندر آگے تھا۔ مسلمان قتل ہو گئے اور جو قتل ہونے سے بچے وہ پانی میں ڈوب گئے۔ اس سے پہلے بہت پہلے غرناطہ کا سقوط ہو چکا تھا۔ ۲۵ نومبر ۱۴۹۱ کو اندلس کے قصر حمراء میں آخری بار فجر کی اذان دی گئی اور والی غرناطہ امیر ابو عبداللہ کے گھرانے کی خواتین گریہ وزاری کرتے ہوئے قصر سے باہر نکل رہی تھیں، اب مسلمانوں کے لئے ہندوستان کو اسپین بنانے کی باتیں ہمارے ملک میں کی جا رہی ہیں۔ برما میں مسلمانوں کا قتل عام نہیں رکا ہے پہلے بخارا اور سمرقند میں ترکمانستان میں اسلام کو ختم کرنے کی کوششیں ہو چکی ہیں سقوط غرناطہ کے بعد آہ و فغاں کا سلسلہ جو دراز ہوا تو ابھی تک نہیں تھما، ایک سقوط کے بعد دوسرا سقوط ،ایک ہزیمت کے بعد دوسری ہزیمت، لیکن عجیب بات ہے کہ بہت ساری ہزیمتوں اور شکست و ریخت کے پس پشت ایک بڑا دست سفّاک ہے جس کی طرف خلیجی ریاستوں نے مصافحہ کا ہاتھ بڑھا رکھا ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ اسی دست سفاک و غارتگر کے ہاتھ پر بیعت کر رکھی ہے۔

اسپین میں مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ اقتدار کا سورج باہمی نفاق اور افتراق اور انتشار کے نتیجہ میں غروب ہوا تھا، جب وہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تھی تو صرف ایک حکومت تھی اور جب حکومت پر زوال آیا اور اقتدار کا سورج غروب ہوا تو پندرہ چھوٹی چھوٹی آزاد مسلم ریاستیں اسپین میں قائم ہو چکی تھیں۔ جب مسلمانوں کی عزت واقبال کا سورج غروب ہوا تو اسی زمانے میں ایک نئی دنیا دریافت ہوئی اور امریکہ کا آفتاب طلوع ہوا، ایک آفتاب کے غروب اور دوسرے آفتاب کے طلوع ہونے کے درمیان بڑا گہرا اندرونی ربط موجود ہے، غرناطہ کے سقوط کا جب جشن منایا جا رہا تھا اور ملکہ ازابیلا اپنے شوہر بادشاہ فرڈینینڈ کے ساتھ فاتح افواج وحکام اور درباریوں کی جلو میں غرناطہ کی چابیاں وصول کرنے اور امیر عبد اللہ کے اقتدار کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے تقریب میں شرکت کے لیے پہونچی تو وہاں اطالوی بحری مہم جو اور سیاح مہمان کرسٹوفر کولمبس بھی موجود تھا جسے سقوط غرناطہ کی تقریب میں شرکت کے لیے اور جشن کے نظارہ کے لئے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ کرسٹوفر کولمبس ۱۴۵۱ میں اٹلی میں پیدا ہوا وہ بڑا ہو کر بحری جہاز کا ملاح اور مہم جو بنا، سمندری جغرافیہ پر حیران کن سائنسی معلومات اسے حاصل تھیں، کولمبس کو ایک ایسے مقتدر سیاسی سرپرست کی ضرورت تھی جس کے تحت وہ نئی دریافت کردہ کالونیوں کو قانونی ملکیت کے حصار میں لائے، بات یہ تھی کہ پرتگال کے بادشاہ جان دوئم سے اور فرانس کے بادشاہ اور برطانیہ کے حکمرانوں سے کولمبس نے سرپرستی کی درخواست کی تھی، لیکن سب نے درخواست کو شرف قبولیت

سے محروم رکھا، ۱۴۸۵ء میں کولمبس اسپین کے شاہی دربار سے مدد حاصل کرنے کے غرض سے اسپین آیا اور قرطبہ میں مقیم ہو گیا اس وقت اسپین میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان نبرد آزمائی جاری تھی اور مسلمانوں کی حکومت کا چراغ بجھ جانے کے قریب تھا، ۱۴۵۲ء میں مسلمانوں کی حکومت کے سقوط کے ساتھ ملکہ ازابیلا نے اپنی سلطنت کو دور دراز تک وسعت دینے، شاہی خزانے کو مالدار کرنے اور ملک گیری کی ہوس کے لیے کولمبس کو شرف ملاقات بخشا، کولمبس نے وعدہ کیا کہ میں جو بھی ملک دریافت کروں گا، وہاں پر عیسائیت پھیلانے کا کام صدق دل اور پوری کوشش سے کروں گا میں نامعلوم زمین پر عیسائیوں کا نمائندہ بن کر اور عیسائی چرچ کا پیغام لے جانا چاہتا ہوں، میں دریافت کردہ ملک سے ہونے والی آمدنی کا معقول حصہ یروشلم میں مسلمانوں سے عیسائی معبدگاہوں کی بازیافت میں خرچ کرنے کا مضبوط ارادہ رکھتا ہوں، کولمبس کی یہ یقین دہانی امریکہ کی تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے، ملکہ ازابیلا فرط مسرت سے جھوم اٹھی اور اس کے ارمان کی کلیاں کھل اٹھیں۔ اور اس نے کولمبس کی تمام شرطیں منظور کیں اور کولمبس کو بحری مہم پر روانہ کیا، کولمبس نے ملکہ کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ نئے ملک امریکا سے حاصل کردہ سونے چاندی کے ڈھیر اس کے قدموں پر لگا دے گا۔ کولمبس اور ملکہ ازابیلا کے درمیان یہی معاہدہ تھا جس سے کولمبس کی مہم جوئی کا آغاز ہوا اور نئی دنیا کی دریافت امریکہ کی شکل میں سامنے آئی، اس لیے امریکہ کی اساس میں اور اجزائے ترکیبی میں اور اس کی کیمسٹری میں بالکل شروع سے اسلام دشمنی سرایت ہو چکی ہے اور گویا اس کی گھٹی میں پڑ چکی ہے۔ اس کے بعد ۱۴۵۲ میں ایک اور نظریہ سامنے آیا اور وہ عیسائیت کا اصول دریافت یا حق دریافت تھا جسے پوپ نکولس پنجم نے پیش کیا تھا، اس نظریہ کی رو سے غیر عیسائیوں کی زمینوں پر قبضہ اور ان کا قتل عام اور ان کو غلام بنانا بالکل درست تھا اور عیسائیت کے اصول حق دریافت کے مطابق یہی حق دریافت تھا جس کے سہارے پرتگال نے افریقہ میں غلامی کی تجارت کو فروغ دیا اور افریقہ کے مغربی ساحلوں پر قبضہ کیا اور اسی نظریہ کے تحت امریکہ کی دریافت بھی ہوئی اور وہاں کے اصلی باشندوں رڈ انڈینز (Red Indians) کا قتل عام بھی ہوا، دلیل یہ تھی کہ وہ غیر مہذب تھے۔ پھر اس نئے دریافت کردہ ملک میں سب کو عیسائیت کا سچا پیروکار اور راسخ العقیدہ عیسائی بنانے کی کوشش کی گئی۔ امریکہ کی نظریاتی بنیاد ملکہ ازابیلا کی اسلام دشمنی اور عیسائیت کے حق دریافت پر استوار ہوئی تھی، اور ان تمام نئے دریافت کردہ علاقوں میں قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا گیا تھا۔ یوروپ کے باشندے بھی امریکہ پہونچے اور انھوں نے بھی وہاں کے اصلی باشندں کو نکالا، ان پر ظلم کیا اور کئی لاکھ رِڈ انڈینز جو وہاں کے اصلی باشندے تھے تہ تیغ کئے گئے۔ اسپین نے ظلم وجور کی امامت کی تھی اور یوروپ کے دوسرے ملکوں نے اقتدا کی تھی ۔ایک تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ کولمبس کی مہم جوئی میں سرمایہ کاری کرنے والے اسپین کے یہودی بھی تھے جو خود بھی عیسائیت کے ظلم کا شکار تھے۔ ایک نئی دنیا کی دریافت میں یہودیوں کو ایک پناہ گاہ مل رہی تھی۔ چنانچہ آج امریکا عیسائیت کی سیاسی طاقت کے ساتھ یہودی طاقت بھی بن چکا ہے،

اسلام دشمنی میں یہ دونوں طاقتیں اب متحد ہو چکی ہیں۔ امریکا اور اسرائیل ایک جان دو قالب ہیں، نو دریافت شدہ امریکہ میں ہسپانوی آبادکاروں نے اور بعد میں برطانوی آبادکاروں نے وہاں کی مقامی آبادی کے ساتھ جو کچھ کیا اسے اجتماعی غارت گری اور دہشت گردی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ دنیا کی وہ قومیں جو اپنے آپ کو مہذب کہتی ہیں ان کی تاریخ کتنی داغدار ہے اور ان کے دامن پر ظلم وناانصافی کے کتنے دھبے ہیں وہ بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ ہیں۔

ملکہ ازابیلا اور کروسٹوفر کولمبس کی دلی خواہش کے عین مطابق نئی دنیا امریکا میں عیسائیت کا ایسا مرکز وجود میں آچکا ہے جہاں سے سارے عالم اسلام کے لیے سازشیں ہوتی ہیں اور مسلمانوں کی ذلت وہزیمت کے خاموش منصوبے تیار کئے جاتے ہیں اور اس کے بعد عالم اسلام میں سقوط وہزیمت کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے اسلامی خلافت کا مرکز قسطنطنیہ ختم ہوا، فلسطین ہاتھ سے گیا، کابل میں امریکہ کی فوجی چھاؤنی قائم ہوئی اور وہاں کی حکومت کو اسامہ بن لادن سے انتقام کے نام پر بے دخل کیا گیا، لاکھوں انسانوں کا خون بہایا گیا، بغداد کا سقوط ہوا اور کئی لاکھ مسلمان عراق میں مارے گئے، اب داعش کے نام پر دوبارہ عراق اور شام میں قتل عام کا سلسلہ جاری ہے۔ مرنے والوں کی بڑی تعداد عام شہریوں کی ہے، پروپیگنڈا یہ ہے کہ داعش کو مارا جارہا ہے۔ داعش نے بہت سی غلطیاں کی ہیں لیکن شب وروز کھلے آسمان سے جو بمباری ہورہی ہے اس کا اصل فائدہ صہیونی اور صلیبی طاقتوں کو اور بشار الاسد کو اور ایران کو پہونچ رہا ہے۔ بشار الاسد دولاکھ انسانوں کا قاتل ہے اور اس کا شمار تاریخ کے بڑے مجرمین میں ہونا چاہیے اور وہ ملک بھی مجرم ہیں جنہوں نے بشار کا ساتھ دیا ہے۔ شام میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، پندرہ لاکھ انسان وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے، بڑی طاقتیں خاموش رہیں اور اب آسمان سے آگ برسائی جارہی ہے۔ کیونکہ عراق میں ظلم کا انتقام لینے کے لئے کچھ لوگ کھڑے ہوگئے تھے۔ یہی بات رجب طیب اردغان نے کہی ہے اور عقل مسلم کی لاج رکھ لی ہے۔ ہنٹگٹن کی کتاب Clash of Civilization میں مسلمانوں کے وجود کو اور ان کی بڑھتی ہوئی عددی طاقت کو اصل خطرہ بتایا گیا تھا شب وروز کی بمباری کے ذریعہ اسی خطرہ کو ختم کرنے کی اور اسرائیل کو محفوظ تر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہماری غفلت اور بےشعوری کا حال یہ ہے کہ اب بیشتر عرب ممالک امریکہ کی فوجی چھاؤنیوں میں تبدیل ہوچکے ہیں اور ان ملکوں کی حفاظت کے نام پر وہاں امریکن آرمی خیمہ زن اور لنگر انداز ہے، حرمین شریفین کی سرزمین بھی امریکی فوجیوں کے گھیرے میں ہے اور اب یہ خوف محسوس ہوتا ہے کہ بساطِ شطرنج پر شہہ پڑنے والی ہے، اللہ حرمین شریفین کا حافظ اور ناصر ہو، اب اس کے بعد ہماری بےآبروئی اور بےتوقیری کی اور کون سی حد باقی رہ گئی ہے۔

زمین تو پاؤں تلے سے سرک چکی لیکن
مناؤ خیر کہ اب سر سے آسمان گیا

سقوط غرناطہ پر ہم آج تک نوحہ کناں ہیں، ۱۸۵۷ میں سقوط دہلی کے بعد سے ہم آج تک مرثیہ خواں ہیں، سقوط

بیت المقدس کا نالہ آج تک نارسا ہے، سقوط ڈھاکہ جنرل نیازی اور یحیٰ خاں کی لغزشوں کا شاخسانہ رہا ہے، سقوط کابل کا حادثہ دل دوز اور خوں چکاں ہے، اور پھر سقوط بغداد نے ثابت کر دیا کہ ہلاکو کی ہلاکت آفرینی کو تاریخ دہراتی رہتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب عہد جدید کے ہلاکو کا دوسرا نشانہ کیا ہے؟ پاکستان یا ایران یا سعودی عرب کی زمین اور آسمان، جہاں مکہ اور مدینہ ہے اور جو عالم اسلام کا دل ہے، سعودی عرب اور خلیجی ممالک مغربی طاقتوں کے جال میں پھنس چکے ہیں ان ممالک نے اخوان سمیت زیادہ تر اسلامی تنظیموں کو دہشت گرد قرار دے دیا ہے سطحی فکر ونظر رکھنے والوں کے لئے دیکھنے میں سب ٹھیک ٹھاک لگتا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس روز ظالم کی نیت بدلی اس روز کیا ہوگا؟ ظلم کے طوفان کا مقابلہ کیسے ہوگا؟ کیا ہم نے طوفان سے پہلے سفینہ تیار کر رکھا ہے؟ کیا ہمارے اندر باہمی اتحاد اور اعتماد ہے؟ امام حسین کا نام لینے والوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انہوں شام میں یزیدی طاقت کا یعنی بشار کا اور اسلام دشمنوں کا ساتھ دیا ہے ۔کیا اب ایران میں شیعیت کا مفہوم بدل گیا ہے؟ کیا اب شیعیت کا یہی مفہوم رہ گیا ہے کہ ہر حال میں نام نہاد اور مذہب بیزار شیعہ کا ساتھ دیا جائے جو جمہوری طریقہ سے برسر اقتدار بھی نہیں آیا ہے۔ آج سیکڑوں کی تعداد میں ایسے شیعہ ایران میں کیوں ہیں جنہوں نے شام کے سلسلہ میں حکومت کی پالیسی سے اختلاف کیا ہے لیکن ان کی بات نہیں سنی گئی۔ اگر آج امام حسین علیہ السلام روئے زمیں پر تشریف فرما ہوتے تو ایران کے حکمرانوں کا گریبان پکڑ کر پوچھتے کہ کیا اسی کو تم نے حسینیت سمجھا ہے؟۔عرب ملکوں کا حال بھی بہت خراب ہے کیا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالمی سازشوں کو عرب ملکوں نے سمجھا ہے؟۔ کیا خلیج کے زرق برق لباس میں ملبوس عقال پوش اور عبا بدوش اور عقل فروش اور دین فراموش تخت نشینوں کو ان مہیب خطرات کا اندازہ ہے؟ جب بشار الاسد کے ظلم کا مقابلہ عرب ملک نہیں کر سکے جس نے ایران کے ساتھ مل کر دولاکھ سے زیادہ اپنے شہریوں کو قتل اور دس لاکھ کو زخمی اور پندرہ لاکھ کو جلا وطن کیا ہے تو مغربی طاقتوں کے جبروت اور قہاری اور ایٹمی طاقت کا مقابلہ وہ کیسے کر سکیں گے۔ ہماری آبرو ایک عرصہ سے داؤں پر لگ چکی ہے لیکن ہم شعور واحساس سے عاری ہو چکے ہیں، نہ اثر خجالت' نہ داغ ندامت، نہ قطرہ انفعال، نہ حزن وملال ۔ ہمارا حال یہ ہو گیا ہے کہ ہماری تمنا کا دوسرا قدم، ہماری آرزو کا سدرۃ المنتہیٰ مغرب کا طرز زندگی اور مغربی طاقتوں کی بندگی ہے۔ ہماری، ہم میں ہر شخص کی، ہر خاص وعام کی، ہر عالم وجاہل کی ہر امیر وفقیر کی ہر گدائے بے نوا کی اور ہر شاہ کج کلاہ کی بے حمیتی عریاں ہو چکی ہے۔ آج نئے سال کا نیا دن ہے اور ہم اندیشہ ہائے دور دراز میں خود کو گھرا ہوا پاتے ہیں۔

آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو
زخم کتنے ابھی بخت بسمل میں ہیں
دشت کتنے ابھی راہ منزل میں ہیں
تیر کتنے ابھی دست قاتل میں ہیں

☆☆☆

فقہی مباحث

فقہی مسالک کے درمیان جمع وتطبیق

سید سلمان حسینی ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء جوفکر ولی اللہی کا ترجمان اور مسلک کے اعتدال پر عمل پیرا ہے وہاں وقتاً فوقتاً ایسے محاضرات اور ورکشاپ ہوا کرتے ہیں جو امت کیلئے علمی وفکری لحاظ سے مفید ہوتے ہیں، شاہ ولی اللہؒ ہندوستان کی تاریخ میں ایسی پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے علمی تنگ نظری پر کاری ضرب لگائی اور ہر مسلک ومشرب سے علمی استفادہ کی راہ ہموار کی، شاہ صاحب کا زمانہ بہر اعتبار انتشار وہنگامہ آرائیوں کا زمانہ ہے، ان ہی ہنگامہ آرائیوں میں فقہی اور مسلکی تشدد کا ہنگامہ بھی برپا تھا، آج پھر وہ سارے ہنگامے عود کر آئے ہیں، ہر شخص اپنے کو توسع کا حامل بتاتا ہے لیکن تعامل تنگ نظری پر ایسا ہے جس نے بڑے مسائل پیدا کر دیے ہیں اور خود مسلمانوں کی صفوں میں منافرت کی ہوا چل پڑی ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے مسلمانوں کی ہر جماعت وہر ادارہ اپنے وقار واعتبار کے لئے اپنا انتساب شاہ ولی اللہ کی طرف کرتا ہے لیکن ان کے افکار ونظریات پر عمل کرنے یا علم وتحقیق کے ساتھ ان کو آگے بڑھانے کا کام تقریباً نہیں ہوتا، شاہ صاحب نے فقہی مسالک کے درمیان جمع وتطبیق کا جو نظریہ پیش کیا اس پر پوری امانت ودیانت داری کے ساتھ واقعی کام ہونا چاہیے، اگر اس نظریہ پر کچھ بھی کام ہوتا اور علمی فکروں اور تحقیقات بسیار کے بعد کسی درجہ میں بھی اس پر عمل ہوا ہوتا تو شاید آج جس طرح دور آخر میں فقہ واجتہاد کے نام پر ایک فتنہ برپا کیا گیا وہ نہ ہوتا، بہر حال اب بھی وقت ہے کہ شاہ صاحب کے افکار پر کام کیا جائے اور بالخصوص ان کی معرکۃ الآراء کتاب حجۃ اللہ البالغۃ کو آسان تر کر کے علماء اور دانشوروں کے درمیان رائج کیا جائے تا کہ وہ اسلامی نظام کی مکمل تصویر کو دیکھ سکیں اور احیاء حکومت اسلامیہ کی اس سنجیدہ علمی کوشش اور فکری تشکیل سے واقف ہو سکیں۔

سر دست یہ مقالہ نذر قارئین ہے جو ۲۰۰۷ء میں کلیۃ الشریعۃ دارالعلوم ندوہ العلماء میں مولانا سید سلمان الحسینی ندوی کا درحقیقت خطاب ہے، انہوں نے علماء، فضلاء، مفتیان اور دراسات علیا کے طلبہ کے سامنے یہ خطاب کیا تھا جس کو محمد مستقیم محتشم ندوی نے رکارڈنگ کی مدد سے نقل کیا، مولانا کی نظر ثانی کے بعد یہ کتابچہ کی شکل میں شائع بھی ہو چکا ہے، بہر حال یہ ایک سنجیدہ علمی اور فکری موضوع ہے جس پر اہل علم وارباب نظر کو سوچنا چاہیے، شاہ صاحب کے اس فکر اور اس سلسلہ کی ایک مستحسن کوشش حکومت قطر کے وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ کے ماتحت ادارۃ الدعوۃ والارشاد کے زیر نگرانی چلنے والی ویب سائٹ http/:Islaweb.net کے مرکز الفتوی کے فتاوی میں نظر آتی ہے، جس میں سبھی علماء کی آراء کا یکساں احترام ہوتا ہے لیکن بات مسالک اربعہ فقہیہ سے ہٹ کر نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی مسلک کی مکمل تقلید ہوتی ہے۔ (مدیر)

اساتذہ گرامی قدر، بزرگان محترم، نمائندگان مدارس، دارالافتا ودارالقضاء سے تعلق رکھنے والے فضلاء، اور عزیز طلبا۔

حمد وتمہید کے بعد:

اس سہ روزہ تربیتی پروگرام میں جو عنوانات منتخب کئے گئے ہیں۔ سب اپنی جگہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان عنوانات میں میں سمجھتا ہوں کہ فکر ولی اللہی اور فقہ ولی اللہی سے متعلق

فقہی مسالک کے درمیان جمع وتطبیق کا موضوع بہت حساس ہے۔ آج تقلید وعدم تقلید کے عنوان سے مسلکی اختلافات شدت اختیار کرچکے ہیں۔ بلکہ افکارونظریات، اورکلامی مسائل کے اختلافات سے لے کر جماعتی اور سیاسی اختلافات میں شدت پیدا ہوتی چلی جارہی ہے، جس کے نتیجے میں لوگ ایک دوسرے سے، اور ادارے دوسرے اداروں سے دور ہوتے چلے جارہے ہیں۔ عالم اسلام میں اس اختلاف نے ایک بڑی مصیبت کی شکل اختیار کرلی ہے۔فرقہ وارانہ اختلاف نے میدان کارزار گرم کردیئے ہیں۔ اور ہندوستان کی سرزمین پر اگرچہ مسلک ولی اللہی سے تعلق رکھنے والے حضرات ہمیشہ مسلکی توسع اور رواداری کی ترجمانی کرتے رہے، لیکن اس کے باوجود وقتاً فوقتاً اختلافات میں کسی نہ کسی حلقے کی طرف سے شدت پیدا کردی جاتی ہے۔ ان حالات میں مسالک کے درمیان جمع وتطبیق کی کوشش کرنا، اورفکر ولی اللہی کو اپنے لئے رہنما بنانا بہت ضروری ہے۔اختلاف رائے کے باوجود ہمارے درمیان اتحاد برقرار رہ سکتا ہے، یہ ہنر سیکھنا چاہئے، ہماری روزمرہ کی زندگی میں جماعتی، تنظیمی، اداری اختلافات کی بنیاد پر ہمارے دلوں میں عداوت پیدا نہیں ہونی چاہئے۔

مجتہدین امت اورعلمائے ملت فقہی اورکلامی اختلافات کو زحمت نہیں بلکہ رحمت کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں'' اختلاف امتی رحمة ''والی حدیث پر اگرچہ کلام ہے، وہ فنی طور پر صحیح درجے کی حدیث نہیں ہے، اور بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جوسند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں لیکن ان کا متن صحیح ہے اور دیگر روایات سے مدلل ہے، کسی بھی حدیث پر حکم لگانے کیلئے محض سند کا مطالعہ کافی نہیں ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ جومتن سند ضعیف کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، اس کی تائید قرآن پاک کی آیات سے، دیگر احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے، صحابہ کرام کے تعامل سے اور مابعد کے علمائے کرام کے اتفاق سے کس درجے میں ہوتی ہے؟ بہت سے ایسے حقائق ہیں جن پر سند کی وجہ سے اشکال پیدا کردیا گیا ہے، لیکن ان کا مضمون قرآن وحدیث اورعلمائے امت کے تعامل سے ثابت ہے۔'' اختلاف امتی رحمة'' والا مضمون بھی اسی نوعیت کا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی قرآن پاک کی آیات سے، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ کے تعامل سے تائید ہوتی ہے اوراس کا بھرپور ثبوت ملتا ہے۔

اختلاف رائے کی دوقسمیں ہوتی ہیں۔ ایک اختلاف مذموم اورایک اختلاف محمود۔ اختلاف مذموم وہ ہے جس کی بنیاد کتاب وسنت نہ ہو محض کسی کی رائے ہو، یا اجتہاد وقیاس میں حدود سے تجاوز کیا گیا ہواور بدون دلائل کے کسی مسئلہ کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہو، ظاہر ہے کہ یہ رائے اس لئے مذموم ہے کہ کتاب وسنت کے خلاف ہے، لیکن اگر اختلاف دلائل کی بنیاد پر ہو اور دلائل پیش کرنے والا وہ ہو جس کو استدلال اور استنباط کا حق حاصل ہو تو اس کی تحقیقی کوشش محمود ہے۔ ہاں ہر شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ جس طرح کورٹ میں وکیل کو ہی پیش ہونے کا حق ہے اور جس طرح کرسئ جج پر جج ہی بیٹھ سکتا ہے، اور جیسے بیماری میں کسی ڈاکٹر سے ہی رجوع کیا جاتا ہے، محض طبی نسخوں کی کتاب پڑھنے والے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ علاج ومعالجہ شروع کردے ،اورقانون کی

کتاب کے مطالعہ سے کوئی جج نہیں بن جاتا۔ اس کو نہ قانونی حق حاصل ہوتا ہے اور نہ علمی دنیا میں اس کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح فقہی اجتہاد واستنباط کا مسئلہ ہے۔

قرآن پاک اور حدیث کے اپنے طور پر مطالعہ سے اجتہاد کا حق حاصل نہیں ہوجاتا ہے، کسی نے قرآن کا ترجمہ پڑھ لیا ہو، حدیث کی کوئی کتاب دیکھ لی ہو، مثلاً صحیح بخاری کا ترجمہ دیکھ لیا، تو اسے یہ درجہ حاصل نہیں ہوتا ہے کہ وہ اجتہاد شروع کردے، فیصلہ صادر کرنے لگے، اپنی رائے پیش کرنا شروع کردے، آج کل عام طور پر طلباء اور مدرسین بھی فقہی اعتبار سے ''عامی'' کے درجے میں ہی ہیں۔ فقہائے کرام نے مجتہد مطلق سے لیکر عامی تک جو طبقات اور مراتب ذکر کئے ہیں، ان کے اعتبار سے مدرسین کا درجہ بھی ایک عامی سے کچھ زیادہ بلند نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت کا جہاں تک تعلق ہے اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ وہ ہندوستان میں علوم اسلامیہ کے مجدد تھے، حضرت مجدد سرہندی نے حکومتی ارتداد کا مقابلہ کیا، اور جھوٹے دین الٰہی کے مقابلہ میں اسلام کی نصرت ودفاع میں کامیابی حاصل کی، ان کی ایمانی اور روحانی توجہ، اصلاح اور تربیت کے ذریعہ ایسی تبدیلی وجود میں آئی کہ اکبر کا ارتداد دور جہانگیری میں کمزور پڑ گیا، اور دور شاہ جہانی میں وہ ماضی کا ایک حصہ بن گیا، اور بتدریج ہندوستان مجددی کوششوں سے گہوارۂ اسلام بن گیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ چودہ سال کی عمر میں نصابیات سے فارغ ہوگئے تھے، اس کے بعد انہوں نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع فرمادیا تھا، وہ دور عام طور پر ہندوستان میں سخت جمود کا تھا، مسلکی تعصب میں بڑی شدت تھی، حنفیت اور شافعیت کی فقہی، کتابی جنگ تو تھی ہی، بنیادی مآخذ سے رابطہ بھی کمزور پڑ گیا تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ قرآن پاک سے یا حدیث نبوی سے اگر براہ راست کوئی دلیل دی جاتی تو بعض لوگ دھڑلّے سے کہہ دیتے کہ ہمیں تو امام ابوحنیفہ کا قول چاہئے، ہمیں حدیث نہیں چاہئے۔ شاید وہ ان علماء کی ہدایت کی بنیاد پر کہتے ہوں گے، جنہوں نے ان کو سمجھا رکھا تھا کہ کسی کو اجتہاد کا حق حاصل نہیں ہے، اور آپ براہ راست حدیث سے استدلال نہیں کرسکتے، علم کلام میں ماتریدی اور اشعری نقطۂ نظر کے درمیان بھی جنگ وجدل کی فضا تھی اور کوئی اصلاحی تحریک نہیں کام کررہی تھی، تصوف کے مختلف حلقوں میں بھی خلیج بڑھتی جارہی تھی۔ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود معرکۃ الاراء مسئلے بنے ہوئے تھے۔ ایسے ماحول میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قلم اٹھایا اور ''البدور البازغۃ'' تصنیف فرمائی، جو ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کا نقش اول ہے۔ اور ''تفہیمات'' میں جو ان کا ایک کشکول ہے، ان کی ایک علمی ڈائری ہے اس صورتحال پر تبصرے کئے، بلکہ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے، معاشرے کی نباضی کی، امراض کی نشاندہی فرمائی۔ اس میں انہوں نے کبھی صوفیہ کو خطاب کیا، کبھی علماء کو، کبھی وزراء وامراء کو، کبھی فوج کے جنرلوں کو، کبھی فوجیوں اور سپاہیوں کو اور کبھی عوام کو، ہر طبقہ کی کمزوری کی نشاندہی فرمائی۔ ''تلبیس ابلیس'' میں ابن الجوزی نے جو طرز اختیار کیا ہے اسی سے ملتا جلتا طرز شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''تفہیمات'' میں اختیار کیا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جو سب سے معرکۃ الاراء کتاب ہے جس نے پوری دنیا کے علماء اور اہل فکر ونظر سے خراج تحسین حاصل کیا وہ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک الہامی کتاب ہے، انہوں نے اس میں پورے اسلامی نظام کو ایک مربوط اور منظّم شکل میں پیش کرنے کی ایسی پہلی کامیاب کوشش ہے جس کی نظیر دور دور تک نہیں ملتی ہے۔ علامہ شاطبی نے '' الموافقات'' میں اور عزالدین ابن عبدالسلام، غزالی، ابن تیمیہ الحرانی جیسے حضرات نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا اور فکر اسلامی کی تجدید اور تشکیل جدید کی کوششیں کی، اور خاص طور پر شریعت اسلامی کے اسرار وحکم کو موضوع بنایا لیکن جس تفصیل کے ساتھ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بارگاہ الٰہی کے ''ملأ اعلیٰ'' سے ریاست کے امراء اور وزارا تک، اور پھر ان سے علماء وصلحاء اور عوام مسلمین تک جس طرح زندگی کے تمام موضوعات عقائد، عبادات، معاشرت، معاملات، اور سیاست اور انتظامی امور وغیرہ پر بحثیں کی ہیں، وہ ایک نادر المثال علمی کارنامہ ہے، جو نہ صرف یہ کہ اپنے مضامین میں بلکہ اپنے اسلوب اور طرز ادا میں بھی منفرد ہے، مولانا منظور نعمانی سے میں نے خود سنا، فرماتے تھے کہ اسلام کو ایسے منظّم اور مربوط انداز میں پیش کرنے کا کام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علاوہ شاید کسی اور سے نہیں ہوسکا۔ انہوں نے پورے دین کو اس طرح پیش کیا کہ سارے احکام گویا ایک لڑی میں پرودئے گئے ہیں۔

شاہ صاحب کا سب سے بڑا مشن ربط وتطبیق واتحاد کا تھا، انہوں نے عقائد میں سلفیت، اشعریت اور ماتریدیت، فقہ میں شافعیت، حنفیت، مالکیت اور حنبلیت، تصوف میں نقشبندیت، چشتیت، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی شرح میں ابن عربی اور مجدد الف ثانی کو باہم آمیز کردیا، اور ان سب کو شیر وشکر بنادیا۔ انہوں نے جمع وتطبیق کا جو موقف اختیار کیا اس نے تضاد کو اتفاق سے بدل دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے تفہیمات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ میری طبیعت تقلید کے لئے بالکل تیار نہیں لیکن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مجھ سے مطالبہ کیا گیا کہ میں پابندی قبول کروں، فیوض الحرمین مکاشفات اور مراقبات پر مبنی کتاب ہے، مدینہ منورہ میں دوران قیام جن مراقبات اور مکاشفات سے انہیں نوازا گیا، اس کی روداد انہوں نے اپنی اس کتاب میں درج کی ہے۔ اس میں ایک وصیت یہ بھی تھی کہ تم عمل میں لوگوں کی مخالفت نہ کرو۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے متعدد مقامات پر یہ بات لکھی ہے کہ مجھ سے طلب کیا گیا ہے کہ میں عمل میں اس کی رعایت کروں، تاکہ معاشرے میں کوئی انتشار نہ ہو۔ انہوں نے اس کا ذکر بھی فرمایا کہ جب میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں تو حنفیت کی پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں، لیکن جب اپنی نماز تنہائی میں پڑھتا ہوں، تو اپنی ترجیحات پر عمل کرتا ہوں، مثلاً رفع یدین کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے لکھا ہے کہ رفع یدین اور عدم رفع یدین دونوں ثابت ہیں، لیکن رفع یدین ارجح ہے۔ پھر بھی انہوں نے لوگوں کے سامنے اس پر عمل نہیں کیا، ایسے ہی مثلاً وہ وتر کی ایک رکعت، پانچ رکعات یا سات رکعات کے قائل ہیں لیکن عمل مشہور قول پر کرتے رہے، جہراً بسم اللہ پڑھنا، امام کے پیچھے قرأت، عید کی تکبیرات کی تعداد وغیرہ بہت سے موضوعات ہیں جن کے

بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ یہ اختلافات صرف ترجیحی بنیادوں پر ہیں، اور سب چیزیں قابل عمل ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنی شرح مسوی اور مصفی میں جا بجا اپنی ترجیحات کا تذکرہ کیا ہے۔ مولانا عبدالحیؒ لکھنوی نے مصفی کے بارے میں لکھا ہے کہ تکلم فیہ کلام المجتہدین اس میں انہوں نے مجتہدانہ گفتگو کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مقدمے میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ بندۂ ناچیز کو اجتہاد کا ملکہ حاصل ہے۔ اور بھی مختلف مقامات پر انہوں نے اپنے لئے اجتہاد کا دعوی کیا ہے، جبکہ کہیں کہیں وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ الحنفی مسلکاً والشافعی تدریساً۔ مسلک کے اعتبار سے اگر چہ میں حنفی ہوں لیکن تدریس میں شافعی ہوں۔

تفہیمات میں اس کا بھی ذکر ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کس طرح مسائل پر عمل کرتے ہیں، تو فرمایا کہ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ائمہ اربعہ کے مسالک میں جمع وتطبیق سے کام لوں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جمع وتطبیق کے کام میں سب سے زیادہ حنفیت اور شافعیت میں جمع وتطبیق کا مسئلہ درپیش آتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے عملی طور پر اس بات کی کوشش کی کہ حنفیت کو شافعیت کے اور شافعیت کو حنفیت کے قریب لایا جائے کیونکہ اگر یہ دونوں مسالک ایک دوسرے سے قریب ہوجاتے ہیں تو پھر زیادہ اختلافات باقی نہیں رہ جاتے۔ مالکیت، حنبلیت اور حنفیت کے درمیان اتنے اختلافات نہیں ہیں جتنے کہ حنفیت اور شافعیت کے درمیان ہیں۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارۂ روحانی سے یہ تجویز پیش کی ہے کہ فقہ حنفی کی تجدید کی جائے، اور امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف اور امام محمد کے اقوال کا احادیث کی روشنی میں جائزہ لیا جائے اور جس کی رائے احادیث صحیحہ کے زیادہ قریب ہو، اسے اختیار کیا جائے۔ اس پر مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے اپنے مقالے میں یہ بات لکھی تھی کہ اگر فقہ ولی الٰہی کی روشنی میں فقہ حنفی کی ترتیب وتدوین حضرت شاہ صاحب کی رائے کے مطابق کی جائے، تو پھر حنفیت اور شافعیت کے بمشکل پندرہ بیس مسائل میں اختلافات باقی رہ جائیں گے، اکثر اختلافات ختم ہوجائیں گے۔

اس سلسلہ میں میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ کی کتاب کا جب نزول ہوا اور حضور اکرمؐ کی احادیث جب سامنے آئیں تو وہ نہ حنفی تھیں نہ شافعی، نہ مالکی، نہ حنبلی، قرآن سب کے لئے تھا، حدیثیں سب کے لئے تھیں، علماء وفقہاء کے غور وخوض، تشریح وتوضیح اور استنباط واجتہاد کی بنیاد پر ان کی تحقیقات اور اجتہادات سامنے آئے اور معاشرہ پر ان کے اثرات مرتب ہوئے، اور اپنے اپنے علاقوں میں ان کی چھاپ قائم ہوتی چلی گئی، لوگ ان کا اتباع کرتے چلے گئے، اور فطری طور پر کسی علاقہ میں کسی فقیہ کے فقہ کا رواج ہوگیا، اس میں نہ کسی کی پلاننگ کو کوئی دخل تھا، نہ تعصب اور حلقہ واریت کو۔ امام مالکؒ مدینہ منورہ میں درس دیتے تھے، ان کے شاگردوں کے ذریعہ ان کی فقہ مراکش اور اندلس تک پہنچ گئی۔ مدینہ منورہ اور جزیرۃ العرب میں ان کا مسلک اتنا نہیں پھیلا، جتنا کہ وہ افریقہ کی شمالی پٹی میں پھیل گیا، اسپین میں پھیل گیا۔ امام مالک کے شاگردوں میں بڑے بڑے اجلۂ علماء

انہیں علاقوں سے اٹھے۔یہی صورت حال امام ابوحنیفہؒ کی رہی۔وہ عراق میں رہے،وہاں ان کی شخصیت اور علمی تحقیق کا گہرا اثر ہوااور پھران کے اثرات ایران،خراسان،ترکستان، ہندوستان تک پھیلتے چلے گئے۔فطری طور پر یہ علاقے متاثر ہوتے گئے،اس میں کسی کی منصوبہ بندی یا پلاننگ کو کوئی دخل نہ تھا،امام شافعیؒ حجاز میں رہے،عراق میں رہے، بعد میں مصر تشریف لے گئے ،ان کا مسلک عراق میں پھیلا ،شام اور مصر میں بھی پھیلا، امام احمد بن حنبل بغداد میں رہے ، ان کا مسلک بغداد میں اور دیگر علاقوں میں محدود طور پر پھیلا۔ایک طویل عرصے تک ان کا مسلک بہت زیادہ نمایاں نہیں رہا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ائمہ ثلاثہ کو فقہاء میں ، اور امام احمد ابن حنبل کو محدثین کی فہرست میں شمار کرتے ہیں، اگر چہ وہ ائمہ اربعہ میں ہیں،لیکن حضرت شاہ صاحب ان کے مسلک کو شافعی مسلک کا ضمیمہ قرار دیتے ہیں۔

کتب حدیث میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے سب سے زیادہ توجہ ''موطا'' پر فرمائی اور ان کا یہ فرمانا ہے کہ ''موطا'' حدیث کی بنیادی اور اولین کتاب ہے، بخاری اور مسلم اس کی شرح اور تکمیل کی حیثیت رکھتی ہیں۔امام بخاری اور امام مسلم کا کام اس شکل میں سامنے آیا کہ انہوں نے احادیث کے بڑے ذخیرے سے اعلی درجہ کی صحیح احادیث کا انتخاب فرمایا۔امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی وغیرہ حضرات نے اصل کوشش اس پر صرف کی کہ فقہائے کرام کے متدلات یکجا کردیئے جائیں، تاکہ فقہاء کی آراء کے مآخذ واضح ہوجائیں، اور یہ واضح کردیا جائے کہ جو مسلک چل رہا ہے اس کے پیچھے دلائل کیا ہیں اور ان دلائل کی حیثیت کیا ہے؟ امام ترمذیؒ نے اس کا بھی اہتمام کیا کہ دلیل کی حیثیت کو بھی واضح کردیا، حدیث صحیح ہے یا ضعیف، شاذ یا منکر اس کو بھی بیان کیا، اور اس سلسلہ کی دیگر احادیث کی طرف اشارہ بھی کردیا، ساتھ ہی ساتھ ائمہ فقہاء کی آراء بیان کیں۔

محدثین کرام اور فقہائے عظام نے وقت کی ضرورت اور تقاضے کی تحت اپنے اپنے کام انجام دیئے، ان ائمہ فقہاء میں چار حضرات بہت ممتاز اور نمایاں ہوئے، اور ان کو ایسے شاگرد ملے، جنہوں نے ان کے مسلک کا تعارف کرایا، اور اس کی علمی خدمت انجام دی۔امام اوزاعی، امام ابوحنیفہ کے درجے کے سمجھے جاتے تھے، اور امام لیث بن سعد، امام مالک کے ہم پلہ قرار دیئے جاتے تھے، لیکن ان دونوں کا مسلک زیادہ نہیں چل سکا، اپنے دور میں ایک بڑی تعداد ان کے مسلک پر عمل کرتی تھی، بہت سے لوگ ان سے فتوی لیتے تھے، ان سے رجوع کرتے تھے، لیکن ان کا مسلک رائج نہیں ہوسکا۔ اسحاق بن راہویہ، امام احمد بن حنبل کے معاصر اور برابر کے درجے کے تھے، دونوں فقہ اور حدیث کے امام تھے لیکن امام احمد کے مقابلے میں اسحاق بن راہویہ کا مسلک نہیں چلا۔ عبداللہ ابن مبارک کا مسلک بھی باقاعدہ چلتا تھا، امام ترمذی ائمہ فقہاء میں ان کا بھی حوالہ دیتے ہیں لیکن ان کا مسلک بھی رائج نہیں ہوا۔ائمہ اربعہ کے ساتھ خدا تعالی کی خاص تائید اور توفیق تھی، اللہ کی طرف سے ان کا انتخاب ہوا، مابعد کی تاریخ سے یہ حقیقت واضح ہوتی چلی گئی۔امام ابن الصلاحؒ نے اپنی کتاب ''معرفۃ علوم الحدیث'' میں ائمہ مسالک کا تذکرہ

کرتے ہوئے فرمایا: ائمة المذاهب الخمسة المشهورة ۔ اس میں پانچواں مسلک سفیان ثوری کا تھا۔ ابن الصلاح ساتویں صدی ہجری میں تھے، وہ اس وقت کے مشہور پانچ مسالک کی بات کررہے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسلامی قانون سازی اور اس کے تسلسل اور فقہ کی تدریجی ترقی کا بڑا منصفانہ جائزہ لیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی طبیعت میں اعتدال وانصاف کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور جامعیت اور اجتماعیت ان کا مشن تھا، وہ چاہتے تھے کہ ملت کی شیرازہ بندی ہو اور انتشار کو دور کیا جائے۔ بہرحال انہوں نے بارہویں صدی ہجری میں یہ صدا لگائی کہ مسالک میں جمع وتطبیق کی ضرورت ہے۔ یہ اس وقت ایک بالکل اجنبی اور نامانوس سی صدا تھی، لیکن دھیرے دھیرے، عالم اسلام کے مفکرین اور دعوتی اور اصلاحی کام کرنے والے اب اس رخ پر بڑھتے چلے جارہے ہیں، یہاں تک کہ دینی مدارس اور علمی حلقوں میں اب یہ مذاکرہ کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم عہد اول کی طرف رجعت اختیار کررہے ہیں۔ آخری زمانے میں جب حضرت مہدی تشریف لائیں گے، تو وہ نہ حنفی ہوں گے نہ شافعی، نہ مالکی نہ حنبلی، وہ خود مجتہد ہوں گے۔ قرآن پاک اور حدیث نبوی ہی کی بنیاد پر وہ پوری امت کی قیادت فرمائیں گے۔ اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ان کی آمد کے موقع پر امت مجتمع ہوچکی ہوگی، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ مسیحؑ بھی ان کی قیادت کو تسلیم کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت نہ مسلکی اختلافات باقی رہیں گے، نہ کلامی، نہ جماعتی نہ گروہی، اس اجتماعی صورتحال تک پہنچنے کیلئے تدبیری انتظامات بھی چاہئیں، الحمدللہ ہم فکرولی اللہی کی روشنی میں ان ہی تمہیدی راستوں پر چل رہے ہیں۔

جہاں تک تحریک ندوۃ العلماء اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کا تعلق ہے وہ فکر ولی اللہی کا ترجمان اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے منہج اور طریقۂ کار کا علمبردار ہے۔ ۱۹۷۵ء میں جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۸۵ سالہ جشن تعلیمی منعقد ہوا تھا، اس وقت حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ نے ایک بہت بڑے چارٹ پر ایک تحریر عباسیہ ہال کے دروازہ کے اردگرد آویزاں کروائی تھی جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ ندوۃ العلماء اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مسلک وہی ہے جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا مسلک ہے، اس کا اظہار واعلان اہتمام سے کیا گیا تھا تاکہ یہ بات تمام حاضرین پر پوری طرح واضح ہوجائے کہ ہم فکر ولی اللہی کے امین ہیں، ہم ان کے شارح وترجمان ہیں، افسوس ہے کہ اس پر جو کام ہونا چاہئے تھا وہ ابھی تک نہیں ہوا، کتنی عجیب بات ہے کہ کتنی ضروری اور غیرضروری کتابوں کے ترجمے عربی سے اردو، اردو سے عربی میں کئے گئے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کا اجتہادی شاہکار ''مصفی'' شرح ''موطا'' کا ترجمہ نہیں ہوا، اس معرکتہ الاراء کتاب میں انہوں نے اصول فقہ کی تشکیل جدید کی طرح ڈال دی ہے اور مجتہدانہ شرح کا ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ اپنی آراء اور اجتہادات بھی بیان فرمائے ہیں اور جمع وتطبیق کی کوشش کا ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ میں اللہ تعالی کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے زمانہ طالبعلمی سے فکر ولی اللہی کی ترجمانی کی توفیق عطا فرمائی۔ مجھے مولانا علی میاںؒ اور مولانا منظور نعمانی کی صحبتوں میں حضرت

شاہ صاحب کے مقام کو سمجھنے کا موقعہ ملا، پھر ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے درس اور شاہ صاحب کی سوانح اور علمی کارناموں پر متعدد کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا، الفرقان کے سن ۱۹۴۱ء کے شاہ ولی اللہ پر خاص نمبر کے مطالعہ کا خوب موقعہ ملا، اور میں نے اپنے فضیلت کے سندی مقالہ کیلئے حضرت شاہ صاحب کے منہج فقہی کو اپنا موضوع بنایا، بعد میں یہ مقالہ دو کتابوں میں شائع ہوا، ایک ''تاریخ التشریع الاسلامی واسباب الاختلافات الفقہیۃ فی ضوء آراء الامام الدھلوی'' اور دوسرا ''التقلید والاجتہاد عند الامام الدھلوی'' کے عنوان سے، ادھر چند سالوں سے دارالعلوم کے دراسات علیا کے طلباء سے حضرت شاہ صاحبؒ کے متعدد رسالوں پر کام کرانے کا موقع ملا، اور موطا کی شرحیں ''مسوی'' اور ''مصفی'' شائع کی گئیں۔

میری دیرینہ تمنا ''مصفی'' کے ترجمہ کی تھی، جو الحمدللہ پوری ہوئی، اور فارسی اصل سے عربی ترجمہ دو جلدوں میں مکمل ہوکر شائع ہوا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''فیوض الحرمین'' میں فقہ حنفی کی تجدید یا تشکیل جدید کا جو طریقہ کار بیان فرمایا ہے کہ ائمہ ثلاثہ ابوحنیفہ، ابویوسف، اور محمد بن الحسن کے اقوال میں اقرب الی الاحادیث الصحیحۃ کو اختیار کیا جائے۔ اس پر بھی میں نے کام شروع کرایا تھا، جو ابھی تشنہ ہے۔ حضرت شاہ صاحب ان تینوں کو مجتہد مطلق مانتے ہیں۔ انہوں نے اپنے استاد سے اکثر اصول میں اتفاق کرتے ہوئے بعض اصول اور بہت سی فروع میں اختلاف کیا ہے۔ عام طور پر یہ شہرت ہے کہ وہ مجتہد فی المذہب ہیں، لیکن شاہ صاحب کے نزدیک یہ تینوں مجتہد مطلق ہیں۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کا سرچشمہ حضرت ابراہیم نخعی کی فقہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ابراہیم نخعی اور ابوحنیفہ کے اقوال کا موازنہ کیجیے تو آپ اس کی تصدیق کریں گے کہ اکثر جگہ امام ابوحنیفہ ابراہیم نخعی سے متفق ہیں۔ اسی طرز پر ابویوسف اور محمد بن الحسن نے اپنے استاذ گرامی سے استفادہ کیا ہے، ان سے قیاس واجتہاد سیکھا ہے، اور وہ ان سے اکثر اتفاق کرتے ہیں لیکن بہت سے مسائل میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ بھی ابراہیم نخعی کی فقہ کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے، کہ تقریباً دوتہائی مسائل میں دونوں شاگردوں نے امام صاحب سے اختلاف کیا ہے، جس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تقریباً ساٹھ فیصد مسائل میں اختلاف ہے، یہ ایک قابل تحقیق موضوع ہے۔ امام ابویوسف کی صحبت مدینہ منورہ کے محدثین وعلماء کے ساتھ بھی خوب رہی، اور امام محمد بن الحسن تو باقاعدہ امام مالک کے تین سال شاگرد رہے، ان کی خدمت میں ''موطا'' کی روایت حاصل کی، ان کی شخصیت میں فقہ مالکی اور فقہ حنفی دونوں جلوہ گر ہیں، اگرچہ وہ اصلاً امام ابوحنیفہ کے ترجمان ہیں۔ امام محمد کی ''روایت موطا'' امام مالک کے دیگر شاگردوں کی روایات سے بعض پہلوؤں سے ممتاز ہے۔ انہوں نے اس میں اپنی آراء بھی ذکر فرمائی ہیں۔ بہرحال امام محمد دونوں مدرسوں کے فارغ ہیں۔

اسی طرح امام شافعیؒ بھی دونوں مدرسوں کے فارغ ہیں، وہ ایک طرف امام محمد کے شاگرد ہیں، دوسری طرف امام مالک کے، فقہی بصیرت کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ انہیں امام

محمد کے مدرسے سے ملی ،لیکن حدیث کا خاص ذوق مالک بن انس اور سفیان ابن عیینہ سے ملا، دونوں کے اصول اجتہاد سے استفادہ کرتے ہوئے ، انہوں نے اپنے مسلک کے اصول ''الرسالہ'' میں مرتب فرمائے۔ان کو احادیث کے بڑے ذخیرہ تک پہونچنے کے مواقع حاصل ہوئے اور بہت سی جگہوں پر انہوں نے دونوں مسلکوں سے اختلاف رائے ظاہر فرمایا، میرا یہ خیال ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد کی آراء اور امام شافعی کی آراء کا موازنہ کرنا چاہئے۔اور امام شافعی کے اقوال پر اسی طرح غور کرنا چاہئے جس طرح احناف امام ابو یوسف اور امام محمد کے اقوال پر کرتے ہیں۔امام شافعی اگر امام ابوحنیفہ کی مجلس میں ہوتے ،تو ان کی مجلس کے ایک اہم رکن ہوتے ، اور ان کو دیگر ارکان مجلس کی طرح اختلاف رائے کا پورا موقعہ ملتا، وہ اگر بعد زمانی کے ساتھ حاصل ہوا تو اس سے فقہی نظام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مسلک حنبلی شاہ صاحب کی نظر میں فقہ شافعی کی ایک شاخ ہے، امام احمد امام شافعی کے شاگرد تھے، انہوں نے فقہ میں ان سے براہ راست استفادہ کیا اور متعدد محقق علماء کی ان کی فقہ کے بارے میں وہی رائے ہے، جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے ہے۔

ہمیں فقہائے صحابہ سے فقہائے تابعین تک، اور ائمہ فقہاء سے ان کے شاگردوں تک ، اسی طرح ان کی فقہ اور اجتہادی آراء کا جائزہ لینا چاہئے جیسے صحابہ کرام کی احادیث اور آراء بغیر کسی حلقہ واریت اور مسلکی تقسیم کے ہم جائزہ لیتے ہیں، یہ سارے حضرات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، ان سب سے استفادہ اسی نقطۂ نظر سے ہونا چاہئے۔بعد کے دور میں جو مسلکی حلقے پیدا ہوئے اور فقہی شخصیات کے الگ الگ حلقے بن گئے ،اور پھر ان کے درمیان دوریاں پیدا ہوتی گئیں، یہ حقیقی اسلامی روح کے خلاف ہوا۔اسلام اس حلقہ واریت کا قائل نہیں ہے، نہ وہ دین وعلم کے میدان میں تعصب کی اجازت دیتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ ائمہ اربعہ کی فقہ میں تطبیق واتحاد کے قائل تھے، کیا ہی اچھا ہو کہ ان تمام ائمہ فقہاء بالخصوص ائمہ اربعہ کی فقہ کو پوری ملت کا مشترک سرمایہ سمجھا جائے، اور سب سے مشترک طور پر استفادہ کی شکلیں پیدا کی جائیں، محدثین کرام کی عظیم علمی کوششوں کو اس میں شامل کیا جائے، اور متفق علیہ باتوں کو ترجیح دی جائے، اور اختلافات کی گنجائش رہنے دی جائے۔فقہاء احناف میں جنہوں نے تحقیقی اقوال اختیار کئے اور احادیث کی روشنی میں اقوال فقہاء کا جائزہ لیا، ان کی کوششوں کو نمایاں کیا جائے، اور خالص فقہی تخریجات کے پابند اور مسلکی دائرہ میں ''مفتی بہ'' کے طوق سے گلوبند حضرات کے فیصلوں کو بنیادی حیثیت نہ دی جائے۔اگر امام صاحب کی طویل صحبت میں رہنے والے، ان سے مسلسل استفادہ کرنے والے، اور ان کے عزیز شاگرد ان سے اختلاف کررہے ہیں، تو مریدان باصفا ''پیر نہ پرد مریداں می پرانند'' کا مصداق کیوں بنے ہوئے ہیں؟ حق وانصاف کی بات یہ تھی کہ ان حضرات کے اقوال پر غیر جانبدارانہ غور وفکر ہونا چاہئے، پھر ترجیح کا فیصلہ اسی بنیاد پر کیا جانا چاہئے۔یہ بات اصولاً تو ائمہ فقہاء کے درمیان ترجیحات میں ملحوظ رہنی

چاہئے تھی ۔لیکن کم از کم فقہائے احناف میں تو اس کو لازماً ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

خلفائے راشدین کی سنت، ان کے اجتہاد اور رائے کی جب بات آتی ہے تو بعض کم عقل سلفی یہ کہتے ہیں کہ ہمیں عمرؓ کی سنت نہیں چاہئے! ہمیں رسول اللہ کی سنت چاہئے! ظاہر ہے کہ یہ حماقت ''علمی بدویت'' اور ''ابلہی'' کے سوا کچھ نہیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر وحضرت عمر کو خاص مقام تشریعی عطا فرمایا ہے، ارشاد فرمایا:اقتدوا بالذين من بعدي ابي بكر وعمر اور تمام خلفائے راشدین کو مجموعی طور پر ایک مقام تشریعی عطا فرمایا ہے۔ارشاد فرمایا: عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ حضرت شاہ صاحب نے ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء میں اس موضوع پر بڑی سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔

ترتیب یہ ہے کہ سب سے پہلے کتاب اللہ ہے، پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر ابوبکر وعمر کی سنت، پھر عثمان وعلی کی سنت، پھر اہل بیت نبوی کی سنت اور طریقہ کار، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بسند صحیح ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:''تركت فيكم أمرين لن تضلوا إن تمسكتم بهما كتاب الله وعترتي''(۱) اس لئے خلفائے راشدین اور اہل بیت نبوی شرعی طور پر حجت ہیں، یہ موضوع تفصیل طلب ہے، اس وقت صرف اشارہ کررہا ہوں۔اس کے بعد اجماع امت ہے، جس میں سرفہرست اجماع صحابہ ہے، جس پر اس آیت سے بھی استدلال فرمایا گیا ہے: ﴿ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤ منين نوله ماتولى ونصله جهنم وساء ت مصيرا﴾ ''سبيل المؤمنين'' کو حجت قرار دیا جارہا ہے، اسی حقیقت کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یوں فرمایا تھا ''ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن'' اور حضورؐ کا یہ قول کتب احادیث میں صحت کے ساتھ منقول ہے:''لا يجتمع امتي على ضلالة ومن شذ شذ في النار'' اور یہ بھی آپ کا ارشاد ہے: ''يد الله على الجماعة ومن شذ شذ في النار'' مزید ارشاد ہے:''عليكم بالسواد الاعظم''۔لہذا خلفائے راشدین اور اہل بیت(۱) کے بعد اجماع علماء امت ہے، اس کو شرعی حجت کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے۔ ہر دور میں علماء کی ذمہ داری ہے اور اہل حق علماء کے بارے میں پیشین گوئی ہے کہ ''يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتأويل الجاهلين'' اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان حضرات کی نشاندہی ہو کہ وہ کون سے علماء ہیں جن کے بارے میں حضورؐ پیشین گوئی فرمارہے ہیں، ان کی پہچان اس لئے ضروری ہے کہ وہ معیار حق رہیں گے، ان کا اتباع ہونا چاہئے، انہیں کے بارے میں مزید آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

(۱) یہ روایت ترمذی، نسائی، مسند احمد بن حنبل وغیرہ صحیح اور حسن سندوں سے موجود ہے، لیکن اہلسنت کے ہاں خلفاء راشدین کے ساتھ جو اہتمام ہے اور سنت الخلفاء الراشدین کا جتنا حوالہ دیا جاتا ہے، جبکہ سندی اعتبار سے یہ حدیث زیادہ قوی ہے، نہ اس کا حوالہ دیا جاتا ہے اور نہ اس کے ساتھ وہ اعتناء ہے جو ہونا چاہئے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کو بھی موضوع بنانا چاہئے۔

فرمایا:'لاتزال طائفة من أمتى ظاهرين على الحق لايضرهم من خذلهم الى قيام الساعة"۔ یہ حدیث مذکورہ بالا حدیث کی تائید کررہی ہے، پھر اور مزید وضاحت فرماتے ہوئے ارشادفرمایا: " ان الله تبارك وتعالى سيبعث على رأس كل مأة سنة من يجدد لهذه الأمة أمر دينها" اس سے معلوم ہوا کہ ہرصدی میں حضور کی نمائندگی کرنے والے علمائے مجددین ومصلحین ضرور موجود رہیں گے، یہ حضورؐ کی صاف پیشین گوئیاں ہیں، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ صرف صحابہ کرام کو ہی ہمیں اپنے سامنے نہیں رکھنا ہے، کیونکہ ہر دور میں نئے مسائل درپیش آتے رہے ہیں، اور آتے رہیں گے، نئے چیلنج سامنے آتے ہیں۔ مقابلہ ہر دور میں باطل سے درپیش رہا ہے اور رہے گا، اس لئے ہرصدی میں تجدید واصلاح کا کام ضروری ہے، تجدید اجتہاد کی متقاضی ہے، اس لئے ہرصدی میں اجتہاد بھی ضروری ہے۔ مسائل کلامی ہوں یا فقہی، انفرادی ہوں یا اجتماعی، معاشرتی ہوں یا معاملاتی، سیاسی ہوں یا معاشی، ہر دور میں تجدید واجتہاد کی ضرورت باقی رہے گی، اور اللہ تعالی کی ربوبیت عامہ اس کا انتظام کرتی رہے گی، یہاں تک کہ علم حق مہدی علیہ السلام اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔

بہرحال امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اپنی اپنی کوشش کرتے رہے، اپنے نتائج فکر پیش فرماتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ ہماری اندھی تقلید نہ کرنا، بے سمجھے بوجھے اتباع نہ کرنا، امام ابوحنیفہ نے فرمایا تھا: کسی شخص کیلئے جائز نہیں کہ وہ میرے قول پر فتوی دے جب تک اسے یہ نہ معلوم ہوجائے کہ میری دلیل کیا ہے، یہی بات امام ابویوسف سے منقول ہے، امام محمد بن الحسن سے منقول ہے، امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور تمام ائمہ سے اسطرح کے اقوال منقول ہیں، ان کے بارے میں تعصب نہ برتا جائے اور ان کی اندھی تقلید نہ ہو۔

جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے، جو مآخذ دین سے ناواقف ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ علمائے حق سے رجوع کریں، اور بغیر کسی انتشار کے علماء کی رہنمائی میں عمل کریں۔ ان کا حق یہ نہیں ہے کہ وہ دلائل سے بحث کرنا شروع کردیں، وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ قرآن کی تفسیر سے واقف نہیں ہیں، احادیث کے مضامین، ان کی صحت وعدم صحت، ان سے استنباط کے طریقے سے واقف نہیں ہیں، جس کا بھی یہ حال ہے اس کی حیثیت عوام کی سی ہے، اس کو عالم اور فقیہ سے رجوع کرنا چاہئے۔

بہرحال میں حضرت شاہ صاحب کے نقطۂ نظر اور مسلک کا ذکر کررہا تھا، ان کی اصل کوشش بین المذاہب جمع وتطبیق کی تھی، خاص طور پر حنفیت اور شافعیت میں جمع وتطبیق، اس لئے وہ فرماتے تھے کہ میں عملاً حنفی اور تدریساً شافعی ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ کیوں شوافع واحناف مل کر یہ کام نہیں کرتے، اس کی بہترین جگہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ہے، یہاں شافعی طلباء بھی پڑھتے ہیں اور حنفی بھی ہیں، کیا اچھا ہو کہ حنفی اور شافعی طلباء مل کر یہ علمی کام انجام دیں، اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تجویز کو بروئے کار لائیں۔ دونوں مسالک کے اصولوں پر بھی غور ہونا چاہئے اور فروع پر بھی، پھر مالکیہ اور حنفیہ کا تقابلی مطالعہ آسان

ہوجائے گا، اورفقہ حنفی وفقہ حنبلی کے درمیان بھی رابطہ واضح ہوجائے گا،اورامت ایک متفقہ مسلک کی طرف بڑھتی جائے گی۔ہمیں فقہا ومحدثین کا ادب واحترام ملحوظ رکھنا چاہئے، ان کے ادب واحترام کا اولین تقاضہ ہے کہ ہم ان سب سے مستفید ہوں، ان کے علم اوراجتہاد کی قدر کریں، ہم یہ مان کر چلیں کہ محدثین نے موادفراہم کیا، اس کی چھان بین کی، اور اس کو بڑی تفصیل کے ساتھ مرتب کرکے پیش کردیا، ان کی حیثیت عطار کی ہے اور فقہاء کی حیثیت اطباء کی، اطباء کے نسخوں سے حسب ضرورت فائدہ اٹھانا چاہئے اور عطار کی دوکان سے دوالینا چاہئے۔امام اعمش نے امام اوزاعی سے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ سے کہا تھا أنتم الأطباء ونحن الصيادلة آپ لوگ ڈاکٹر ہیں اور ہم عطار، ہماری دوکان پر دوائیں موجود ہیں لیکن ہم مرض کی تشخیص نہیں کرسکتے ہیں، نہ علاج بتاسکتے ہیں، یہ کام فقہاء کا ہے۔

فقہی تحقیقات پیش کرنے اوراس کے جامع نظام کو وضع کرنے میں اولیت امام ابوحنیفہ کو حاصل رہی ہے، اس کا امام شافعی نے اعتراف بھی کیا ہے، اوراظہار بھی۔انہوں نے فرمایا تھا: الناس في الفقه عيال على أبي حنيفة سارے لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے محتاج ہیں، بغیر ان کے فقہ کے اصول وضوابط سمجھنا اوراجتھاد کے راستے میں چلنا مشکل ہے۔امام ابوحنیفہ کی قبر کے قریب جو مسجد ہے اس میں ایک مرتبہ امام شافعی نے نماز فجر پڑھائی تو قنوت نہیں پڑھا، ان سے اسکے بارے میں پوچھا گیا کہ آپ تو قنوت کے قائل ہیں، آپ نے قنوت کیوں نہیں پڑھا؟ فرمایا کہ ابوحنیفہ کی رائے کا احترام مانع رہا، ان کی رائے کو میں نے یہاں عملاً ترجیح دی، یہ صاحب قبر کے ساتھ ان کا غایت درجہ کا ادب تھا۔امام ابوحنیفہ حیات ہوتے تو سوچیئے کہ ان کا قدرومحبت کا معاملہ کیسا ہوتا۔امام ابویوسفؒ ایک مرتبہ مدینہ منورہ آئے، ایک کنویں کے پانی سے وضوفرمایا، نماز پڑھی، بعد میں کسی نے بتایا کہ کنویں میں چوہا گرگیا تھا، اورآپ کا مسلک تو یہ ہے کہ کنویں کا پانی پاک نہیں رہا۔فرمایا کہ اس وقت اہل مدینہ کے مسلک پر عمل کرلیتے ہیں، امام ابویوسف جب عید کی نماز پڑھاتے تھے تو خلیفہ عباسی ہارون رشید پیچھے نماز پڑھتے تھے، اوروہ کیونکہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے منقول تکبیرات کو پسند کرتے تھے لہذا امام ابویوسف ان کی روایت کے مطابق سات تکبیرات پہلی رکعت میں اور ۵ تکبیرات دوسری رکعت میں ادا کرتے تھے۔ اس طرح بہت سی مثالیں ائمہ کرام کے آپس کے لحاظ واکرام واحترام کی موجود ہیں۔آج جو تنگ نظری کا ماحول ہے اور جو ایک عرصے سے چلی آرہی ہے وہ درحقیقت عجمیت زدہ ہے، صاف ستھرا عربی ذوق عجمیت سے متاثر ہوکر مکدر ہوگیا۔صحابہ، تابعین، تبع تابعین، اورخود ان کے متبعین کا یہ مزاج نہیں تھا۔

بہرحال میری خواہش یہ ہے کہ فکر ولی اللہی کا تعارف کرایا جائے، امت میں اسے زندہ کیا جائے اور''حجۃ اللہ البالغۃ'' کو بھی اس نقطۂ نظر سے پڑھا اور پڑھایا جائے، یہ حکومت اسلامیہ کے احیاء کے نظام کی ایک زبردست علمی وفکری کوشش وکاوش ہے جس میں شاہ صاحب فکر اسلامی کو پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔''حجۃ اللہ البالغۃ'' علمائے کرام اورطلباء دراسات علیا کے مطالعے میں ضروررہنی چاہئے،

امت کی شیرازہ بندی کے لئے اس کے ذریعہ جو جامع نظام دیا گیا ہے،اس کو بروئے کار لانے کی کوشش کرنا چاہئے ، ائمہ کرام کے مسالک پر بے جا تنقید اور منفی رویہ درست نہیں ہے۔

سلفیت کے نام سے جو مسلکی ہنگامہ آرائی کی جارہی ہے، اس کا سلف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔صحابہ کرام،تابعین عظام اور محدثین وفقہاء کے طریقہ کار کے بالکل خلاف ہے ۔یہ امت میں انتشار برپا کرنے کی ایک سازش ہے،محدثین کرام، اصحاب الحدیث ،اہل الحدیث کا طرز دیکھنا ہوتو سنن الترمذی دیکھیں کہ مختلف مسائل کی احادیث کے تذکرہ اوراس صراحت کے بعد کہ یہ یہ حدیث ضعیف ہے، وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کے مطالب،فقہاء کرام کے مسالک ذکر کرتے ہیں،اس پر نہ وہ ناراض ہوتے ہیں،نہ فقہاء پر تنقید کرتے ہیں، بلکہ ایک معتبر معمول کی حیثیت سے بغیر کسی تشنیع کے اس کا تذکرہ فرماتے ہیں، یہ اہل حدیث کا طریقہ کار ہے،اسی پر ابوداؤد، نسائی،دارمی وغیرہ کا عمل ہے،لہذا مسلکی اختلاف کی بنیاد پر جماعت بندی، گروہ بندی،اورالگ الگ مساجد کا قیام ایک شیطانی فتنہ ہے،جس پر ملمع کاری کے ساتھ سلفیت کا لبادہ اوڑھا دیا گیا ہے ۔نماز کے مسائل جو روز مرہ پانچ وقت کا اجتماعی عمل تھا اور قدیم صحابۂ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے ایک ایک جزئیہ پر عمل کرتے ہوئے تقریباً اٹھارہ ہزار مرتبہ دیکھا تھا،اس میں جتنے بھی اختلافات ان سے منقول ہیں وہ صرف تنوعات ہیں۔صحابہ کرام کا تعامل اس سلسلہ میں حجت ہے،اور تنوع اور توسع کے ساتھ امت میں یہ تعامل مستقل ہوتا چلا آرہا ہے۔اس لئے روایتیں تلاش کرکے تعامل کے خلاف فضا بنانا،اور جھگڑا پیدا کرنا کسی طرح درست نہیں ہے، ثناء مختلف الفاظ ،بسم اللہ زور سے یا دھیمی آواز سے پڑھنا،امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا،نہ پڑھنا،آمین بلند یا پست آواز سے کہنا، یہ سب جائز صورتیں ہیں۔امام ترمذیؒ نے اپنی سنن میں ناف کے نیچے، ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا،ان سب شکلوں میں توسع ہے۔ان میں کوئی چیز قابل رد نہیں ہے۔یاد رکھئے کہ آپس کا تفرقہ اورنزاع حرام ہے، یہ چوری اور بدکاری سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔آپس کا تفرقہ دین مونڈ دینے والا استرہ قرار دیا گیا ہے، اس لئے ہمارے تعلیمی اداروں کو خاص طور پر ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے ۔ اکثر مدارس ہی علمی جھگڑوں کا اکھاڑا بن جاتے ہیں،ان کو کلامی اور مسلکی فقہی اختلافات کا دنگل بنادیا جاتا ہے ،پھر مساجد اکھاڑا بن جاتی ہیں جس کے نتیجے میں ملت کی اجتماعیت پارہ پارہ ہوجاتی ہے۔اس لئے ان علمی وتعلیمی مراکز پر پوری توجہ اصلاح حال کی مرجوز ہونی چاہئے ،اورفکر ولی اللہی اور فقہ ولی اللہی کے خطوط پر کام کی داغ بیل ڈالنی چاہئے۔

اللہ تعالی ہمیں دین کی سوجھ بوجھ عطا فرمائے، ہماری صفوں میں اتحاد فرمائے ،اور ہر تفرقہ سے ہمیں محفوظ فرمائے۔

(آمین)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆

بحث وتحقیق

مستشرقین اور حدیث

محمد فرید حبیب ندوی

گذشتہ صفحات میں گولڈ زیہر کی طرف سے اموی حکومت اور امام زہری پر لگائے گئے اعتراضات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جا چکا ہے، اس کے علاوہ بھی موصوف نے کچھ اور اعتراضات کئے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے، موصوف نے لکھا ہے۔

پہلا اعتراض: امویوں کی طرف سے حدیثیں گھڑنے کا یہ سلسلہ صرف سیاسی اور ذاتی مفاد تک ہی محدود نہ رہا بلکہ دینی اور عباداتی امور و مسائل میں بھی حدیثیں وضع کی گئیں، چنانچہ مسلک اہل مدینہ کے خلاف بہت سے مسائل میں حدیثیں گھڑی گئیں۔ مثلاً:

۱۔ جمعہ کے دو خطبے تھے اور دونوں بیٹھ کر ہوتے تھے، لیکن امویوں نے اس میں تبدیلی کی اور اموی خلفاء جمعہ کا دوسرا خطبہ بیٹھ کر دینے لگے۔ اور اس کی دلیل کے طور پر ان حضرات نے رجاء بن حیوہ کی وضع کردہ اس حدیث کو پیش کیا کہ ''حضور پاک علیہ السلام اور خلفاء راشدین بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے، حالانکہ جابر بن سمرہؓ کا ارشاد ہے کہ جو کوئی یہ کہے کہ رسول پاک علیہ السلام نے بیٹھ کر خطبہ دیا وہ جھوٹا ہے۔

۲۔ عید کا خطبہ نماز کے بعد ہوتا تھا، لیکن اموی خلفاء نے نماز سے پہلے کر دیا۔

۳۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے منبر کی سیڑھیوں میں اضافہ کیا۔

۴۔ حضرت معاویہ نے مقصورہ (چھوٹا کمرہ) تعمیر کرایا، جسے بعد میں چل کر عباسیوں نے گرا بھی دیا۔

دوسرا اعتراض: یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ امویوں نے مصلحت کے پیش نظر خوب حدیثیں گھڑیں، مگر عباسی دور میں ان حدیثوں کو ظاہر ہونے سے روک دیا گیا اور وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں، علماء جرح وتعدیل کے مندرجہ ذیل اقوال سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اموی دور میں یہ کاروبار خوب ہوتا تھا۔

۱۔ محدث ابو عاصم نبیل کا قول ہے: صلحاء سب سے زیادہ حدیث کے باب میں جھوٹ بولتے ہیں۔

۲۔ زیاد بن عبداللہ بکّائی کے بارے میں امام وکیعؒ

نے فرمایا: زیّا دحدیث میں اپنے مقام و مرتبہ کے باوجود جھوٹ بولتا تھا۔

۳۔ یزید بن ہارون کا قول ہے کہ ان کے زمانہ میں سوائے ایک کے کوفہ کے سارے محدثین تدلیس کیا کرتے تھے، یہاں تک سفیان بن عیینہ اور سفیان ثوری بھی۔

تیسرا اعتراض: اموی دور میں حدیثیں وضع کی جاتی تھیں اور موضوعات کی بڑی تعداد پھیل چکی تھی، اس کی تائیداس بات سے بھی ہوتی ہے کہ

۱۔ محدثین کواس دور میں موضوعات کی کثرت کا احساس ہوگیا تھا، چنانچہ حدیثوں کی جانچ پرکھ کا اصول انہوں نے یہ بنایا تھا کہ جوحدیث قرآن سے مشابہ ہوتی اسے قبول کیا جاتا، اور جومخالف ہوتی اسے ردکردیا جاتا۔

۲۔ اور انہیں یہ بھی محسوس ہوگیا تھا کہ جید الاسناد حدیثوں میں بھی بہت سی موضوع حدیثیں ہیں، ان کے اس احساس اور اصول کو مزید تقویت اس حدیث سے ملی کہ حضورﷺ نے فرمایا: ’’عنقریب میری حدیثوں کی کثرت ہوجائے گی، توجوکوئی تم سے کوئی حدیث بیان کرے اسے قرآن پرمنطبق کرکے دیکھے، اگراس کے مطابق نکلے تو وہ میری ہی حدیث ہوگی، خواہ میری زبان سے سے نکلی ہو یا نہیں۔

۳۔ اوپرذکرکردہ بات کو بہت سی معتبرروایات کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے، مسلم نے ایک روایت بیان کی ہے کہ ’’أن النبی ﷺ أمر بقتل الکلاب إلا کلب صید أو کلب ما شیۃ‘‘ حضرت ابن عمررضی اللہ کو بتایا گیا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس میں ’’کلب زرع‘‘ کا بھی اضافہ کرتے ہیں تو ابن عمرؓ نے فرمایا: کہ ابوہریرہؓ کی کاشت کی ایک زمین تھی، (جس کی وجہ سے انہوں نے یہ اضافہ کیا)

ابن عمرؓ کے اس قول سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ محدثین اپنے اغراض و مقاصد کے لئے حدیثوں میں کیا کچھ کرتے تھے۔

(۴) بعض فقہی قواعد ثابت کرنے کے لئے جب حضور پاک علیہ السلام کی شفوی روایات (زبانی روایات) نہ مل سکیں تو کچھ ایسے صحیفے ظاہر کئے گئے جو آپ علیہ السلام کے ارادہ کی وضاحت کرنے والے تھے۔ اوراس چیز پرنکیر کے بجائے اس کی تصدیق کی گئی، چنانچہ جب کوئی مسئلہ پیش آتا اوران صحیفوں کے کسی نسخہ میں اس کا کوئی حل نظر آتا تو اسی پر بھروسہ کرلیتے، پھرنہ اس کی تحقیق کرتے کہ کہاں سے آیا، اورنہ یہ دیکھتے کہ یہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ مثلاً:

وضاعین کی جرأت پراس واقعہ سے حیرت ہوتی ہے کہ جب بعض لوگوں نے شمالی عرب اورجنوبی عرب کے درمیان حد بندی کی کوشش کی تو ایک ’’معاہدہ نامہ‘‘ ظاہر کیا گیا جو تبع بن معدی کرب کے زمانہ میں یمنیہ اورربیعہ کے درمیان ہوا تھا، اوراس حمیری امیر کے کسی پوتے کے پاس سے دستیاب ہوا تھا۔

جب یہ حضرات اس جیسے صحیفہ کو قبول کر سکتے ہیں تو اس میں کیا دشواری ہے کہ قریبی زمانہ کا بھی اگرکوئی صحیفہ مل جائے تو اسے بھی قبول کرلیں۔

گائے وغیرہ کی زکوۃ کی تفصیل کے بارے میں کوئی صحیح حدیث نہ مل سکی تو ان وصایا پر اعتماد کیا گیا جو دراصل مختلف شہروں کو بھیجے گئے قاصدوں کورخصت کرتے وقت حضور پاکؐ

نے انہیں وصتیں کی تھیں۔ جیسے معاذ بن جبلؓ کو کی گئی وصیت، عمران بن حزمؓ کے نام لکھا گیا آپ کا خط۔ رواۃ حدیث نے انہی وصایا کے مشتملات کونقل کر دیا۔ اسی طرح حضرت ابن عمرؓ کے پاس ایک دستاویز تھی، جس کا ایک نسخہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے نقل کرایا تھا، اور امام زہریؒ نے اس نسخہ کی تصحیح کی تھی جیسا کہ ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔

اسی طرح حضور پاک علیہ السلام کی مہر کے ساتھ ایک دستاویز اور ہے (ابو داؤد نے ہی اس کا ذکر کیا ہے) حماد بن اسامہ نے ثمامہ بن عبداللہ بن انس کے حوالہ سے اسے ظاہر کیا تھا، اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ دستاویز انس بن مالک کو دی تھی جبکہ وہ زکوۃ وصول کرنے جارہے تھے۔

ان اعتراضات کی حقیقت!

پہلے اعتراض کی حقیقت: یہ مستشرق ہم مسلمانوں کے بارے میں عجیب وغریب ذہنیت رکھتا ہے، اسی وجہ سے ایسی باتیں کرتا ہے، ورنہ جو کچھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کیا اس کا دین کے ساتھ کھلواڑ کرنے یا اس میں تحریف کرنے سے دور کا بھی واسطہ نہیں، بلکہ قدیم زمانہ سے اب تک حکماء وامراء اپنی زندگی کی حفاظت، اپنے اثر ورسوخ کے اظہار کے لئے بہت سی کارروائیاں کرتے رہے ہیں، اسی طرح ملک میں اور عبادت کی جگہوں میں بھی اصلاحات کرتے آئے ہیں، مگر ان کے اس عمل کے بارے میں کبھی کسی کے ذہن میں بھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ چیزیں ان کے تلاعب بالدین پر دلالت کرتی ہیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن کا کام کیا، حضرت فاروق رضی اللہ نے لوگوں کو تراویح کی جماعت پر جمع کیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمعہ کی اذان کا اضافہ کیا اور عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسجد نبوی میں توسیع کی۔ مگر ان کو صرف وصرف اصلاحات ہی سمجھا گیا، کبھی کسی نے بھی ان کارروائیوں کی وجہ سے ان حضرات پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ا۔ جہاں تک جمعہ کے خطبہ ثانیہ میں بیٹھنے کی بات ہے، تو ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ عبادت میں ایک طرح کی تبدیلی تھی جو حضرت معاویہؓ کے ذریعہ سامنے آئی، لیکن آپ نے بدنیتی سے یہ تبدیلی نہیں کی، اور نہ ہی اپنے اس عمل کی تائید میں کوئی جھوٹی حدیث گھڑی، آپ نے ایسا مجبوری کی وجہ سے کیا، اور وہ مجبوری یہ تھی جیسا کہ شعبیؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کا جسم بہت موٹا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک کھڑے نہیں ہوسکتے تھے۔ یہ ایک مجبوری تھی، اور مجبوری کی حالت میں تو نماز میں بھی بیٹھنے کی اجازت ہے چہ جائیکہ خطبہ میں۔

مگر اس کے باوجود بھی علماء نے ان پر نکیر کی تھی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ علماء حق بات کہنے میں کسی مداہنت ومجاملت کے روادار نہ تھے۔

بیہقیؒ کی روایت ہے کہ کعب بن عجرہ نے عبدالرحمان بن حکم کو بیٹھ کر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا تو منع کیا، مگر عبدالرحمٰن نے اپنے عمل کی تائید میں نہ کچھ کہا اور نہ ہی جھوٹی حدیث پیش کی۔

گولڈزیہر نے یہ بات جو کہی ہے کہ رجاء بن حیوۃ نے یہ روایت بیان کی تھی کہ حضور پاک ﷺ اور خلفاء راشدین بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے تو یہ سراسر ایک ثقہ امام ومحدث پر جھوٹ اور بہتان ہے۔ انہوں نے کبھی بھی اس طرح کی کوئی روایت نہیں

بیان کی، آپ کی ثقاہت وعدالت کو دیکھ کر یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ اتنا بڑا جھوٹ بول سکیں، تمام ائمہ جرح وتعدیل آپ کی ثقاہت ودیانت پر متفق ہیں، غالبًا اس مستشرق نے حضرت والا پر یہ الزام لگانے کی اس وجہ سے کوشش کی ہے کہ آپ ملک شام میں تھے اور اموی خلفاء سے آپ کے مراسم تھے، جیسا کہ اسی وجہ سے امام زہریؒ کے ساتھ اس نے یہ گستاخی کی ہے۔

اور حضرت جابر بن سمرہؓ کی حدیث اس ضمن میں پیش کر کے جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس سلسلہ میں جھوٹی حدیث وضع کی گئی تھی جس کے جواب اور رد میں حضرت جابرؓ نے یہ حدیث بیان کی، یہ محض اس کا گمان ہے، ورنہ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ آپ نے کسی جھوٹی حدیث کے رد میں یہ روایت بیان کی، جہاں آپ اور حدیثیں بیان کرتے تھے وہیں یہ حدیث بھی سنائی تھی، مقصد غالبًا یہ ہوگا کہ اگر کوئی اس طرح کا ارادہ رکھتا بھی ہے تو باز آجائے۔

۲۔ عید کا خطبہ مروان نے نماز سے پہلے کر دیا تھا، لیکن اس نے اپنے اس عمل پر معذرت بھی کی تھی جیسا کہ بخاری نے روایت کیا ہے کہ جب حضرت ابوسعید خدری نے اسے ٹوکا تھا تو اس نے اپنی غلطی تسلیم کی تھی اور وجہ یہ بیان کی تھی کہ نماز کے بعد لوگ خطبہ سننے رکتے نہیں ہیں، اس مجبوری کے پیش نظر میں نے ایسا کیا، لیکن کہیں بھی اس نے اپنے اس عمل پر کوئی جھوٹی حدیث پیش نہیں کی۔

۳۔ حضرت معاویہ رضی اللہ کا منبر کی سیڑھیوں میں اضافہ کرنا بھی کوئی ایسی بات نہیں جس پر اعتراض کیا جاسکے۔ خود حضور پاک علیہ السلام کا بھی پہلے باقاعدہ کوئی منبر نہیں تھا، مگر جب لوگ زیادہ ہوگئے تو آپ نے تین سیڑھی والا منبر بنوایا، اب اگر لوگوں کی کثرت کی بنا پر حضرت معاویہؓ ایسا کرتے ہیں تو اس میں شرعًا اور عقلًا کیا قباحت ہے! اور حضرت معاویہؓ اپنے اس عمل کو دین بھی قرار نہیں دیتے ہیں بلکہ ضرورتًا ایسا کرتے ہیں۔

۴۔ مقصورہ کی تعمیر آپ نے اپنی جان کی حفاظت کی خاطر کی تھی جبکہ خارجی آپ کو قتل کرنے کے چکر میں تھے۔ نہ کہ دین میں تبدیلی کے مقصد سے۔

دوسرا اعتراض اور اس کی حقیقت: مستشرق ہذا نے یہ جو دعوی کیا ہے کہ اموی حکومت کی مصلحت میں بہت سی جھوٹی حدیثیں گھڑی گئی تھیں جو عباسی دور خلافت میں پوشیدہ ہوگئیں، یہ بالکل نرالا دعوی ہے، آخر اس طرح کی احادیث کہاں ہیں؟ اور کس طرح وہ چھپی رہ گئیں؟ اور ان کو پوری طرح چھپانے میں عباسی کس طرح کامیاب ہوگئے؟ کیا انہوں نے محدثین کو ان حدیثوں کے ذکر سے منع کر دیا تھا؟

ہاں! یقیناً کچھ حدیثیں مخفی ہوگئی تھیں، مگر ان کے مخفی ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بالکل ہی ناپید ہوگئی ہوں، وہ موجود تو ہیں مگر ان کے موضوع ومکذوب ہونے کی وجہ سے کتب صحیحہ اور معتبر مسانید میں انہیں جگہ نہ دی گئی، اور یہ تو ہر باطل اور جھوٹ کا حال ہوتا ہے کہ سچ کے سامنے اسے چھپنا ہی پڑتا ہے۔

۱۔ محدث ابوعاصم نبیل کے قول کی جہاں تک بات ہے تو گذشتہ صفحات میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ کس کس طرح محدثین نے وضاعین کی قلعی کھولی، اور حدیث کے قبول کرنے

کے لئے کیا کیا شرطیں لگائیں اور کس طرح رواۃ کی جرح وتنقید کی، چنانچہ اس ضمن میں انہوں نے وضاعین کے مختلف طبقوں کا بھی ذکر کیا جن میں ایک طبقہ صوفیہ اور صلحاء کا بھی تھا۔

مگر ظاہر ہے کہ اس سے مراد حقیقی صلاح وتقوی نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو پھر تو سعید بن مسیّب، عروہ، شافعی، مالک، احمد، أبو حنیفہ، حسن اور امام زہری جیسے تمام حضرات جھوٹے ٹھہرتے کہ یہ سب کے سب اہل صلاح وتقوی تھے،

بلکہ ان صلحاء سے مراد ایسے سیدھے سادھے لوگ تھے جو فن حدیث کی باریکیوں سے واقف نہ تھے اور ظاہراً بڑے نیک لگتے تھے، تو علماء نے ان کی حقیقت واضح کردی کہ ان کی ظاہری صلاح سے کوئی دھوکہ میں نہ پڑ جائے، بلکہ یہ بھی تحقیق کرلی جائے کہ اس ظاہری صلاح کے ساتھ حقیقی صلاح وتقوی اور حدیث کی معرفت بھی ہے یا نہیں۔

۲۔ وکیع کا جو قول پیش کیا ہے اس میں اس مستشرق نے خیانت سے کام لیا ہے، اور زبردست تحریف کی ہے، ''تاریخ کبیر'' کی اصل عبارت ہے "هو اشرف من أن يكذب" کہ زیاد جھوٹ سے بہت بالاتر ہیں، اور موصوف نے اس طرح تحریف کی کہ "كان مع شرفه فى الحديث كذاباً" کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

اس سے آپ ان مستشرقین کی امانت کا اندازہ کرسکتے ہیں!

۳۔ تدلیس کے لفظی معنی سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے، یہ محدثین کی ایک خاص اصطلاح ہے، اس کی دو قسمیں ہیں، تدلیس اسناد، اس کا مطلب ہے کہ راوی اس شیخ کے حوالے سے جس سے اس نے نہ سنا ہے اور نہ ملاقات کی ہے اس طرح روایت کرے جس سے اس کے سماع یا ملاقات کا شبہ ہوتا ہو، دوسری قسم ہے تدلیس شیخ، اس میں راوی اپنے شیخ کو اس کے غیر معروف نام یا کنیت سے ذکر کرتا ہے۔

پہلی قسم کو علماء نے مکروہ بتایا ہے اور اس کے قبول کرنے نہ کرنے کی شرائط تفصیل سے بیان کردی ہیں، کہ اگر ایسے صیغہ سے روایت کرے جس سے اتصال کی وضاحت ہو تو اسے قبول کیا جائے گا ورنہ وہ روایت مرسل کے حکم میں ہوگی۔ سفیانین کی روایات اسی پہلی قسم سے ہیں اور محدثین کے نزدیک قابل اعتبار ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یزید بن ہارون نے یہ بات صرف علماء کوفہ کے بارے میں کہی ہے، دوسرے شہروں کے علماء تو تدلیس کرتے ہی نہ تھے، اور علماء نے سفیانین کے تدلیسات کی وضاحت کردی ہے کہ سفیان بن عیینہ صرف ثقات سے تدلیس کرتے ہیں اور ثوری کی تدلیسات تدلیس الشیوخ کی قسم سے ہیں، اور یہ دونوں قسمیں علماء محدثین کے نزدیک قابل اعتبار ہیں۔

تیسرے اعتراض کی حقیقت:

۱۔ اس اعتراض میں دو جگہ افتراء سے کام لیا گیا ہے، اول یہ کہ اس اصول اور اس احساس کی نسبت علماء محدثین کی طرف کی گئی ہے، حالانکہ محدثین نے کہیں بھی یہ اصول بیان نہیں کیا ہے، اور یہ بات کہ جید الاسناد حدیثوں میں بھی موضوع حدیثیں شامل ہوگئی ہیں اس کے احساس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ جو بات کہی گئی ہے وہ خبر واحد کے بارے میں ہے کہ وہ مفید ظن ہوتی ہے، یعنی اگر وہ شروط

وقواعد پر پوری بھی اترتی ہوتب بھی وہ مفید ظن ہوگی مفید یقین نہیں، اور یہ احتیاط فی الدین کے پیش نظر ہے، مگر موصوف مستشرق نے جو بات نقل کی ہے اس کا اس سے کیا تعلق !!

۲۔ دوم یہ کہ اس اصول کے مبدأ کی حیثیت سے موصوف نے جو حدیث پیش کی ہے محدثین نے اسے موضوع قرار دیا ہے، مگر موصوف نے اس کا ذکر تک نہ کیا۔

۳۔ ابن عمر نے ابو ہریرہ پر جو نقد کیا ہے اس کا تفصیلی جواب آگے آئے گا، جہاں ہم نے احمد امین کے افکار کا جائزہ لیا ہے۔

(۴) جن صحیفوں کا ذکر موصوف نے یہ کہہ کر کیا ہے کہ محدثین نے بلا کسی تنقید وتحقیق کے انہیں قبول کر لیا تھا علماء کی عزت شان پر شدید حملہ ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ محدثین نے ان کی خوب تحقیق وتنقید کی، اور بہت سے صحیفوں کو جو شرائط صحت پر پورے نہیں اترتے تھے موضوع قرار دیا، چنانچہ ابن ھدیہ، دینار اور ابوالدنیا الأشج وغیرہ کے صحیفوں پر وضع کا حکم اسی وجہ سے لگایا۔

جہاں تک زکوۃ ونصاب زکوۃ سے متعلق صحیفوں کی بات ہے تو ان کی بھی پوری تحقیق کی گئی۔

حضرت انس کے نام لکھا گیا حضرت صدیق کا صحفیہ تمام علماء نے نزدیک معتبر ہے۔ جسے بخاری، نسائی، ابو داؤد، دارقطنی، شافعی، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

دوسرے صحیفوں کے بارے میں اختلاف ہے، کچھ ان میں سے مرسل ہیں اور کچھ منقطع، لیکن یہ یقینی بات ہے کہ محدثین نے کوئی بھی فیصلہ بلا تحقیق وتنقید نہیں کیا، ان کی تنقیدی بحثیں اس پر دلیل قاطع ہیں۔ اور انہوں نے اس سلسلہ میں دو طریقے اپنائے ایک تو یہ کہ وہ لکھا ہوا ہو، اور دوسرے یہ کہ اس کی زبانی روایت کا سلسلہ متصل بھی ہو۔

اگر ایسا ہی تھا جیسا کہ موصوف نے لکھا ہے کہ جب مفید مطلب حدیث نہ ملتی تو یہ جھوٹے صحیفے ظاہر کئے جاتے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب وہ حضرات ان صحیفوں کا سہارا لے سکتے تھے تو براہ راست زکوۃ اور نصاب سے متعلق حدیثیں ہی وضع کیوں نہ کر دیتے؟

عہد تبع کے جس صحیفہ کا ذکر کیا ہے اس کا تو اس موضوع سے کوئی تعلق ہی نہیں، ظاہر ہے کہ اس کی نسبت رسول پاک علیہ السلام کی طرف ہے ہی نہیں، اور اسے قبول کرنے نہ کرنے میں وہ شرائط ملحوظ نہیں رکھے جاتے جو حضور پاک کی طرف منسوب باتوں میں رکھے جاتے ہیں، دوسری بات ہے کہ جن لوگوں نے اسے قبول کیا وہ حضرات محدثین نہ تھے۔ نہ یہ صحیفہ حدیث کی قسم سے تھا اور نہ اسے قبول کرنے والے محدثین تھے تو پھر اس کا موضوع احادیث سے کیا تعلق؟

یہ ہے ان مستشرقین کے اعتراضات کی حقیقت، یہ اپنے تعصب وتنگ نظری کی وجہ سے اس طرح کی خیانتیں کرتے ہیں، العقد الفرید، أغانی، کتاب الحیوان اور الف لیلہ ولیلہ جیسی کتابوں سے ادھر ادھر سے نقل کر کے حدیث پر اعتراض کرتے ہیں، یہ علمی خیانت ہے ان لوگوں کی جنہیں دور حاضر میں احمد امین جیسے حضرات اپنا استاد مانتے ہیں! تف ہے اس علمی ذہنیت پر! (السنۃ ومکانتہا فی التشریع الإسلامی)

☆☆☆

گوشۂ سیرت (قسط-۱۳)

"اسلام- جس سے مجھے عشق ھے"

آپ کی نرمی آپ کا ثبات

تحریر: مسٹر اڈیار ترجمہ: ایم اے جمیل احمد

بہت سارے قائدین کی زندگی میں ہم ایسے لمحات دیکھتے ہیں کہ وہ خدا کی نصرت سے مایوس نظر آتے ہیں۔ یہ سارے لوگ صالح ہی تھے۔ لیکن ناسازگار حالات میں بعض اوقات ان کی زبان سے ایسے الفاظ نکل جاتے تھے گویا خدا نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

ان حضرات کی زندگی میں نرمی تو نظر آتی ہے لیکن اسی کے ساتھ سخت ترین حالات میں اپنے اصولوں پر ثبات اور وہ جماؤ نظر نہیں آتا جو مطلوب ہے۔

نبی عربی کی شان دیکھیے۔ وہ بزم گفتگو میں جتنے نرم تھے، جدوجہد کے میدان میں اتنے ہی گرم تھے۔ مصائب ومشکلات میں پہاڑ کی طرح ثابت نظر آتے تھے۔

آپؐ کی دعوتِ توحید کو سن کر غصہ سے بھڑک جانے والے لوگوں کا ایک وفد آپؐ کے چچا ابو طالب کے یہاں گیا اور ان کو دھمکی دی کہ یا تو وہ اپنے بھتیجے کو سمجھائیں کہ وہ اس دعوت سے باز آجائے یا وہ قوم اور آنحضورؐ کے درمیان سے ہٹ جائیں، ہم خود محمدؐ سے نمٹ لیں گے۔

حالات کی سنگینی سے ابو طالب پریشان ہوئے۔ آنجناب کو بلا بھیجا اور قریش کے ارادے سے انہیں آگاہ کیا اور محبت بھرے الفاظ میں یہ مشورہ دیا کہ ان حالات میں آپؐ کچھ نرمی اختیار کرلیں۔ اس موقع پر صادق اور ہادئ اعظم کا یہ جواب انسانی عزیمت کی تاریخ میں ایک شاندار باب ہے۔

"اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی لاکر رکھ دیں تب بھی میں اپنی کوشش سے باز نہیں آؤں گا۔ میں اپنی آخری سانس تک اس دعوت کے پہنچانے میں کوئی کمی نہ کروں گا"

مخالفوں نے کتنی ہی ایذائیں آپؐ کو پہنچائیں۔ کوڑا کرکٹ آپؐ پر پھینکا، آپؐ پر پتھروں کی بارش کی۔ نماز کی حالت میں تھے تو اونٹ کی اوجھ آپؐ پر ڈال دی۔ آپؐ کے قتل کے لیے ہر قبیلے کے ایک ایک فرد نے ننگی تلوار لے کر آپؐ کے گھر کا محاصرہ کرلیا۔

ان تمام ناسازگار حالات سے آپؐ کی استقامت

میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔آپؐ کے قدم ذرا بھی نہ ڈگمگائے۔

جنگ کے میدانوں میں آپ کو للکارا گیا۔اس وقت یہی نرم خو انسان پوری استقامت کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔صرف ۳۱۳ جاں نثار آپؐ کے ساتھ تھے جبکہ مخالفین کی تعداد اس سے کئی گنا تھی۔ پوری عزیمت کے ساتھ آپؐ نے مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

میدانِ جہاد میں آپؐ زخمی بھی ہوئے۔آپؐ کے گال پر کاری زخم بھی لگا۔آپؐ کے دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے۔ایک گڑھے میں آپؐ گر بھی پڑے۔تاہم آپؐ کی عزیمت اور آپؐ کی استقامت میں ذرہ برابر بھی کمی نہ آئی۔

مدینہ کا محاصرہ ہوا۔بھوک، فاقہ اور تنگ دستی کے ایام بھی آئے۔کسی بھی حالت میں مایوسی آپؐ کو چھو کر بھی نہ گزری۔ہر حال میں پر امید اور سخت سے سخت حالات میں عزیمت کا پیکر ثابت ہوئے۔

یہ تو اس عظیم نبیؐ کی کیفیت تھی۔آپؐ کے اصحاب کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ یہ حضرات کتنے مظالم کا شکار ہوئے۔ان کا مذاق اڑایا گیا، ان پر پھبتیاں کسی گئیں۔ان پر کوڑے برسائے گئے، تپتی ہوئی ریت پر انہیں لٹایا گیا۔ لیکن ان سبھی حالات میں نبیؐ کے یہ ساتھی پوری قوت کے ساتھ راہِ حق پر جمے رہے۔

توحید اور ایک خدا پر اعتماد ان کی استقامت سے ظاہر ہوتا تھا۔ یہ اصحاب اپنی آخری سانس تک اپنے اصولوں پر جمے رہے۔جان چلی گئی پر یہ اپنے اصولوں سے نہ ہٹے۔

نبیٔ کریمؐ نے اپنے ساتھیوں کو جہاں نرم خوئی سکھائی وہیں اصولوں میں بے لچک رویہ اختیار کرنے کی تعلیم بھی دی۔مخالف گروہ کے ہاتھوں آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہؓ نے شدید مظالم برداشت کیے۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر جب آپؐ اور آپؐ کے ساتھی مکہ میں فاتحانہ داخل ہو رہے تھے تو ان پر نہ تو اس فتح کا کوئی نشہ چھایا ہوا تھا اور نہ ان کے دلوں میں انتقام کا کوئی جذبہ پایا جا رہا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس دنیا نے دیکھا کہ آپؐ کا سر عاجزی سے جھکا ہوا تھا اور ریش مبارک اونٹ کے کوہان کو چھو رہی تھی۔

قریش لرز رہے تھے کہ ہم نے ان لوگوں پر اتنے بھیانک مظالم ڈھائے ہیں، آج ہمارا حشر کیا ہوگا؟

نبی کریمؐ کی محبت بھری زبان سے یہ الفاظ موتیوں کی طرح جھڑ رہے تھے:

''لوگو! آج تم سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا، اللہ تمہیں معاف کرے، وہی رحمٰن و رحیم ہے۔ آج تم سب آزاد ہو''

آپؐ نے اپنے شہید چچا کے کلیجے کو نکالنے والے اور اسے چبانے والی دونوں کو معاف کر دیا۔کیا تاریخِ انسانی اس کی کوئی نظیر پیش کر سکتی ہے؟

اوہ! کتنی بلندی اور کتنی عظمت کی بات ہے یہ!!

☆☆☆

گوشۂ سیرت

امانت کی ادائیگی ہجرت کا اہم پہلو

مفتی تنظیم عالم قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور مذہب اسلام سے کفار مکہ کو شدید اختلاف تھا' وہ دل وجان سے چاہتے تھے کہ آپ ؐ کا لایا ہوا دین پھیل نہ سکے'لوگ اسلام میں داخل نہ ہوں' اس مقصد کے لئے ان لوگوں نے مسلمانوں سے عداوت کی حد کر دی' وہ انہیں مارتے اور مختلف نوعیتوں سے پریشان کرتے تھے' خود رسول اکرم ﷺ کی ذات اقدس کو ان لوگوں نے اپنے ظلم کا نشانہ بنایا اور معاندانہ رویہ اختیار کیا' ان سب کے باوجود اہل مکہ کو آپ کی امانت داری پر پورا یقین تھا' سارے لوگ آپ ؐ کو امین اور صادق کہا کرتے تھے' نبوت سے پہلے اور بعد میں بھی انہیں آپ کے کردار پر کوئی شک نہیں تھا۔ اس لئے وہ اپنا مال آپ ؐ کے پاس امانت رکھواتے تھے' پھر وہ جب چاہتے اپنا مال واپس لے لیتے ان کو جوں کا توں مال مل جایا کرتا تھا' آپ ﷺ نے جب ہجرت کا ارادہ فرمایا اس وقت بھی آپ کے پاس مکہ کے بہت سے افراد کی امانتیں رکھی ہوئی تھیں' آپ نے وہ تمام امانتیں حضرت علیؓ کو سپرد کیں اور ان سے فرمایا کہ میری سبز چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو جاؤ' صبح یہ تمام امانتیں لوگوں تک پہنچادینا۔ رسول اکرم کی روانگی کے بعد تین دن تک حضرت علیؓ نے مکہ میں قیام کیا اور تمام لوگوں کو ان کی امانتیں پہنچادیں' پھر وہ بھی ہجرت کر کے مدینہ کی طرف چل دیئے' قبا میں آپ ؐ سے ملاقات ہوی اور پھر وہیں سے آپ کے ساتھ شریک ہوگئے۔

جس امانت کی ادائیگی کا آپ ؐ نے اس قدر اہتمام فرمایا یہ کسی دوست کی نہیں بلکہ ان لوگوں کی تھی جو آپ ؐ کے سخت دشمن تھے' قدم قدم پر جنہوں نے تبلیغ اسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی تھیں اور جنہوں نے مکہ کی سرزمین کو مسلمانوں کے لئے تنگ کر دیا تھا جس کے سبب وہ گھر بار چھوڑنے اور زندگی بھر تنکا تنکا جمع کر کے تیار کردہ آشیانے کو پھونک دینے پر مجبور ہوگئے تھے' ایسے وقت دنیا کا دستور ہے کہ ظالموں کی جو بھی چیز ہاتھ آئے اسے ہڑپ لیا جائے' ان کو نقصان پہنچایا جائے' ان کے سامان کو توڑا جائے' تباہی اس قدر مچائی جائے کہ ان کے ظلم کے سبب دل پر جو زخم آیا ہے اس پر کسی قدر مرہم لگ سکے اور بدلہ لینے کی وجہ سے دل کو سکون ملے' رسول اکرم ﷺ بھی اگر چاہتے تو اہل مکہ کی ساری امانتیں لے کر خفیہ طور پر مدینہ چلے آتے' اس وقت مال کی سخت ضرورت بھی تھی' جس طرح آپ چھپ چھپ کر مکہ سے مدینہ پہنچے اسی طرح نہایت رازداری کے ساتھ ان کی امانتیں بھی لے کر اگر چل دیتے تو کسی کو اس کا علم بھی نہ ہوتا' مگر قربان جایئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر جنہوں نے اس قدر معاندانہ اور مخالفانہ ماحول کے باوجود اپنی

صفت امانت کو داغدار ہونے نہیں دیا' کفار مکہ کا جو اعتماد آپ ؐ سے وابستہ تھا اسے صدمہ نہیں پہنچایا بلکہ اس میں مزید استحکام بخشا اور ان کی امید کی بحسن وخوبی تکمیل فرمائی۔

امانت کی ادائیگی سے متعلق رسول اکرمؐ کے اس قدر اہتمام اور طرز ادا سے اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مذہب اسلام نے امانت داری کو کس قدر اہمیت دی ہے' کسی شخص کے مال اور اس کے حق کو جوں کا توں اس کے حوالے کر دینا اسلام کی تعلیم ہے' ذرہ برابر بھی اس میں خرد برد کی اجازت نہیں' صاحب امانت خواہ جانی دشمن ہی کیوں نہ ہو' کسی بات کو لے کر اس سے عداوت بھی پیدا ہو جائے اور درمیان میں فاصلے پیدا ہو جائیں پھر بھی امانت میں کسی طرح کی خیانت درست نہیں ۔شریعت اسلامی نے امانت کی ادائیگی کا جس قدر اہتمام کیا ہے کسی دوسرے مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی' اللہ تعالی کو ہرگز یہ بات پسند نہیں ہے کہ کسی کے مال یا حق میں جزوی طور بھی ناجائز تصرف کیا جائے' قرآن کریم نے نیک عمل مسلمانوں کی صفت اس طرح بیان کی ہے: وَالَّذِیْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ (المؤمنون'۸)''اور جو لوگ اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں'' یعنی وہ لوگ اللہ کی نظر میں کامیاب ہیں جو اپنے وعدوں کو نبھاتے ہیں اور امانتوں کو کسی تردد کے بغیر اہل امانت تک پہنچا دیتے ہیں' دوسرے کے مال و دولت سے حرص اور اس میں کسی طرح کا بھی تصرف جائز نہیں' جو شخص امانت میں خرد برد کرتا ہے وہ اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے' امانت داری کا وصف اللہ تعالی کو بہت پسند ہے اس لئے ایک دوسری جگہ امانت کی ادائیگی کا کھلے لفظوں میں حکم دیا گیا ہے' ارشاد باری ہے: إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا (النساء ۵۸)''بے شک تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دیا کرو''۔۔۔امانت جس طرح کی بھی ہو' شریعت اسلامی نے ہر حال میں اس کے ادا کرنے حکم دیا ہے' مسلمانوں کا ہرگز یہ شیوہ نہیں کہ کسی کے مال یا حق کو دبا لے یا صاحب حق سے اجازت کے بغیر اس میں کوئی کمی یا زیادتی کرے' قرآن کریم کی ان آیات کے علاوہ رسول اکرم ﷺ نے بھی متعدد احادیث میں اداء امانت کی بڑی تاکید فرمائی ہے' حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ بہت کم ایسا ہوگا کہ رسول اللہؐ نے کوئی خطبہ دیا ہو اور اس میں یہ ارشاد نہ فرمایا ہو: لا ایمان لمن لا امانة له و لا دین لمن لا عهد له یعنی جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس شخص میں معاملہ کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں (بیہقی' شعب الایمان)۔

اس طرح کی نصوص شرعیہ کی وجہ سے فقہاء کرام نے امانت کی ادائیگی کو لازم قرار دیا ہے' واضح رہے کہ امانت صرف اس کا نام نہیں کہ ایک شخص کے پاس کسی دوسرے شخص کا مال بطور امانت رکھا ہو اور وہ اس کو ادا کردے بلکہ امانت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں مثال کے طور پر کسی مجلس میں آپ بیٹھے ہوں اور وہاں کسی کے متعلق کوئی بات چل رہی ہو جس کو آپ نے سن لیا' تو اس مجلس کی تمام باتیں امانت ہیں ان باتوں کو اجازت کے بغیر دوسروں تک پہنچانا درست نہیں' یہ سراسر خیانت ہے جس کی متعدد نصوص میں مذمت آئی ہے۔اسی طرح اگر کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے' کسی نے آپ سے کوئی مشورہ لیا اور آپ کو اس کے منصوبے اور نجی معاملات کا علم ہو گیا یہ بھی امانت ہے ان کی باتوں کو چھپانا اور اپنے علم و تجربہ کے مطابق صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے' اخلاقی و شرعی ذمہ داری ہے کہ کسی ذہنی تحفظ کے بغیر صحیح صحیح مشورہ دیا جائے اور ان کی باتوں کو مخفی رکھا جائے۔اگر کوئی شخص کسی ادارے' کمپنی یا دکان وغیرہ میں ملازمت کرتا ہے اس سے وقت کا جو معاہدہ ہوا ہے اس کی مکمل پابندی کرنا اور اپنی صلاحیت کے مطابق کسی سستی اور کوتاہی کے بغیر کام کرنا بھی

امانت ہے‘ اگر کوئی شخص کسی کے پاس آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتا ہے یا کام میں چوری کرتا ہے یا دیر سے آتا ہے یا وقت سے پہلے چلا جاتا ہے یا اپنی صلاحیت کا صحیح استعمال نہیں کرتا یہ تمام صورتیں امانت کے خلاف ہیں۔اسی طرح کسی کا کوئی حق اگر آپ کے پاس نکلتا ہے تو وہ بھی امانت ہے اس کو ادا کرنا ضروری ہے۔جیسے باپ کے انتقال کے بعد بہنوں کے میراث کا مسئلہ ہے‘ بھائیوں کی ذمہ داری ہے کہ شرعی اصول کے مطابق جس کا جو حق نکلتا ہے کسی تردد کے بغیر ادا کردیں یہ خیرو برکت اور نزول رحمت کا ذریعہ ہے‘ اس میں ٹال مٹول کرنا یا کسی طرح کی رکاوٹ بننا کسی بھی حال میں درست نہیں‘ اس طرح کا کوئی بھی عمل اللہ کے غضب کو دعوت دیتا ہے یا اسی طرح کسی نے آپ کو کچھ مال دیا تھا اس کی قیمت ادا کرنا باقی رہ گیا تھا وہ شخص بھول گیا آپ کو اس کا علم ہے تو اس کا وہ حق آپ کے ذمے امانت ہے اس کو ادا کردینا آپ کے لئے ضروری ہے۔اسی طرح حکومت کے تمام عہدے اور مناصب بھی امانت ہیں حکام اور افسران کی ذمہ داری ہے کہ جس عہدے کے لئے جو شرائط ہیں وہ شرطیں اور صلاحیتیں جس میں پائی جائیں اسی کو اس پر بحال کریں‘ اپنی ذاتی قربت‘ رشتہ داری‘ دوستی یا کسی اور سبب نااہل کو عہدے سپرد نہ کئے جائیں یہ امانت داری کے خلاف ہے۔اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ امانت کا مفہوم اپنے اندر کافی وسعت رکھتا ہے‘ مالی حقوق کے علاوہ اخلاقی‘ قانونی‘ معاشرتی اور سماجی مسائل بھی اس میں داخل ہیں‘ بہرحال امانت کی جو بھی قسم ہو اس کے ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور رسول اکرم ﷺ نے اپنے قول و عمل کے ذریعے ان تمام قسموں کو صحیح طرح ادا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے ان تمام قسموں کو ملحوظ رکھے بغیر ایک شخص کامل مؤمن نہیں بن سکتا اور نہ ہی اللہ کا قرب نصیب ہوسکتا ہے۔

آج مسلمانوں کے معاملات اور ان کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر شعبۂ حیات کی طرح اس شعبے میں بھی کافی زوال آیا ہے‘ امانت کو لوگوں نے غنیمت کا مال سمجھ رکھا ہے‘ جس کے پاس کسی کا کوئی حق ہے اسے دینے تیار نہیں‘ کام کرنے اور ملازمت میں ایمانداری نہیں ہر شخص اپنی منفعت کو پیش نظر رکھ کر کام کرنا چاہتا ہے‘ امانت داری مسلمانوں کی شناخت ہونی چاہئے لیکن آج مسلمانوں کے عمل سے ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کسی غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کو عنداللہ جواب دہی کا احساس بھی ہے‘ ایک موقع پر امانت کے معاملے میں لاپرواہی کا ذکر کرتے ہوئے رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک وقت لوگ ایسے ہوجائیں گے کہ لین دین کریں گے لیکن کوئی امانت داری نہیں کریگا اس وقت امانت داری کی ایسی کمیاب ہوجائیگی کہ لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانت دار شخص ہے‘ آدمی کی تعریف ہوگی کہ کیسا عقلمند‘ کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے حالاں کہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری نہ ہوگی۔(صحیح بخاری)

یعنی بظاہر امانت داری رکھنے والے بھی اتنے کمیاب ہوجائیں گے کہ پورے گاؤں اور شہر میں کہیں کہیں ایسے افراد ملیں گے جن پر لوگوں کو کافی اعتماد ہوگا اور لوگ ان کا چرچہ کریں گے حالانکہ حقیقت میں وہ لوگ بھی امانت دار نہیں ہوں گے‘ خیانت اس قدر عام ہوجائے گی کہ امانت دار کا ڈھونڈنا مشکل ہوجائے گا۔اہل قلم اور ارباب خطابت کو چاہئے کہ اسلامی نئے سال کے موقع پر جہاں ہجرت اور دوسرے موضوعات پر لکھتے اور بولتے ہیں وہیں امانت داری کو بھی اپنا موضوع بنائیں اور قرآن وحدیث اور سیرت کی روشنی میں اس موضوع کو بھی اجاگر کریں کہ یہ بھی ہجرت کا ایک اہم پہلو ہے۔

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

حکمت-خدا کی ایک عظیم نعمت

محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نور الاسلام کنڈہ پرتاب گڑھ

حکمت (دانائی) وہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے، جس کو حکمت ملی اس کو بڑی نعمت ملی۔ حکمت ایک جامع اور نہایت ہی معنی خیز لفظ ہے، جس سے بہرہ مند ہونے کی خواہش ہر مومن کے اندر ہونی چاہیے۔ حکمت کسی ذہنی کاوش کی پیداوار ہرگز نہیں ہوتی، بلکہ وہ من جانب اللہ اس بندۂ حق کی طرف القا کی جاتی ہے، دنیا سے بے رغبتی اور کم گوئی جس کا شعار ہوتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ اور ابو خلاد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا ''جب تم کسی بندے کو دیکھو کہ اسے دنیا میں زہد اور کم گوئی عطا ہوئی ہے تو اس کی قربت اختیار کرو کیوں کہ اسے حکمت القا ہوتی ہے''۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ زہد اور کم گوئی اختیار کر کے بندہ اپنے کو اس پوزیشن میں لاتا ہے کہ وہ غیب کا مخاطب بن سکے اور حق اس کی طرف متوجہ ہو ایسے شخص سے فیض یاب ہو کر آدمی اپنے ذوق اور رجحان خیالات و تصورات اور افکار و نظریات کی اصلاح کر سکتا ہے اور اپنی زندگی کو سنوار سکتا ہے۔ اس لئے ایسے شخص کی تربیت اور ہم نشینی جسے حکمت بخشی گئی ہو اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔

حکمت اپنی حقیقت کے لحاظ سے ایک نور اور الہامی ادراک ہے۔ اس کا اظہار مختلف شکلوں اور صورتوں میں ہوتا ہے۔ حکمت دلوں میں عرفان اور ایمان اور ذہنوں میں فہم اور بصیرت کی صورت میں اپنی جگہ بناتی ہے اور زندگیوں میں اس کا اظہار شرافت و پاکیزگی، فیاضی، احسان شناسی اور اعلیٰ کردار کی شکل میں ہوا کرتا ہے، قرآن مجید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "ومن یؤتی الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیراً" (البقرۃ آیت ۲۶۹) ''اور جس کو حکمت ملی اسے خیر کثیر ہاتھ آیا''

حکمت تمام ہی بھلائیوں کا سرچشمہ ہے۔ خدا کا ناشکرا وہی ہوسکتا ہے جو حقیقی علم و حکمت سے محروم ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ "ولقد آتینا لقمٰن الحکمۃ أن اشکر اللہ (سورہ لقمٰن آیت ۱۲) ''یقیناً ہم نے لقمانؑ کو حکمت عطا کی اللہ کے شکر گذار رہو'' شکر گزاری کی طرح نیکی اور راست گفتاری وغیرہ کا تعلق بھی حکمت سے ہے۔

جس شخص کو حکمت کی دولت نصیب ہوئی ہے اس کی ہم نشینی اور صحبت اختیار کرنے والا محروم نہیں ہوسکتا، وہ بھی اس سے بہت

کچھ فیض یاب ہوسکتا ہے بعض علماء اور بزرگوں کا قول ہے کہ خدا کی صحبت اختیار کرو اور اگر تم میں اس کی طاقت نہ ہو تو پھر اس شخص کی ہم نشینی اختیار کرو جو خدا کی صحبت اختیار کئے رہتا ہے۔

حکمت کا مفہوم مفسرین کے نزدیک: قرآن مجید میں لفظ حکمت متعدد بار استعمال ہوا ہے، اور ہر جگہ اس کی تفسیر میں مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں، تفسیر بحرمحیط میں "یوتی الحکمة من یشاء" کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب بحرمحیط نے تمام اقوال مفسرین کو جمع کیا ہے وہ تقریباً تیس ہیں مگر آخر میں فرمایا کہ درحقیقت یہ سب اقوال متقارب ہیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں محض تعبیرات کا فرق ہے، کیوں کہ لفظ حکمت احکام بالکسر کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں کسی عمل یا قول کو اس کے تمام اوصاف کے ساتھ مکمل کرنا۔

اسی لئے بحرمحیط میں آیت بقرہ آتٰـه اللّـه الملك والحكمة (۲/۵) جو حضرت داؤد کے متعلق ہے، اس کی تفسیر میں صاحب بحرمحیط نے فرمایا:

والحكمة وضع الأمور فی محلها علی الصواب وكمال ذلك انما يحصل بالنبوة حکمت کے اصلی معنی ہر شئی کو اس کے محل میں رکھنے کے ہیں اور اس کا کمال صرف نبوت سے ہوسکتا ہے، اس لئے حکمت کی تفسیر یہاں نبوت سے کی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نزدیک حکمت سے مراد عقل و فہم اور ذہانت ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ لفظ حکمت جب حق تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جائے تو معنی تمام اشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں اور جب غیر اللہ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تو موجودات کی صحیح معرفت اور اس کے مطابق عمل مراد ہوتا ہے۔

ابوحیانؒ نے فرمایا کہ حکمت سے مراد وہ کلام ہے جس سے لوگ نصیحت حاصل کریں اور ان کے دلوں میں موثر ہو اور جس کو لوگ محفوظ کر کے دوسروں تک پہونچائیں جبکہ بعض مفسرین نے علم کے مطابق عمل کرنے کو حکمت سے تعبیر کیا ہے۔

الغرض اسی مفہوم کی تعبیریں مختلف الفاظ میں کی گئی ہیں کسی جگہ اس سے مراد قرآن ہے، کسی جگہ حدیث، کسی جگہ علم صحیح، کہیں عمل صالح کہیں قولِ صادق، کہیں عقل سلیم کہیں تفقہ فی الدین کہیں اصابتِ رائے اور کہیں خشیۃ اللہ اور آخری معنی تو خود حدیث میں بھی مذکور ہیں۔

"رأس الحكمة خشية الله" یعنی اصل حکمت خدا تعالیٰ سے ڈرنا ہے۔

لفظ حکمت کلام رسولؐ میں

احادیث رسول ﷺ میں بھی کئی جگہ حکمت کے الفاظ مستعمل ہوئے ہیں آپ ﷺ نے حکمت کی اہمیت اور ضرورت سے امت کو روشناس کراتے ہوئے فرمایا:

الكلمة الحكمة ضالة الحكيم فحيث وجدها فهو احق بها (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

"آپ ﷺ نے فرمایا حکمت و دانائی حکیم کی کھوئی ہوئی چیز ہے، لہذا جہاں بھی اس کو پائے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے"

"صاحب مظاہر الحق" اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "حکمت و دانائی کی بات" سے مراد وہ بات ہے جو دین و آخرت میں فائدہ دینے والی ہو۔ اور "حکیم" یعنی دانا سے مراد مومن و مسلمان ہے۔ اب "الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ الحکیم" کا مفہوم یہ سمجھئے کہ دین و آخرت میں فائدہ دینے والی ہر بات

مومنوں کا مطلوب ہے۔ لہٰذا مومن اس بات کو جہاں بھی پائے اس کو لینے کا سب سے بڑا حق دار اپنے ہی کو سمجھے اور فوراً اس کو قبول کرے۔ کیوں کہ جس جس طرح عقلمند آدمی اپنی گم شدہ چیز جب بھی اور جہاں بھی پاتا ہے اس کو فوراً لے لینے میں ذرا پس و پیش نہیں کرتا، اسی طرح مومن کو بھی حکمت و دانائی کی بات کو اپنا گم شدہ سرمایہ اور اپنا مطلوب اور اپنے کو اس کا سب سے بڑا حق دار سمجھنا چاہیے اور اس کی دانشمندی کا تقاضا یہی ہونا چاہیے کہ اس کو فوراً لے لے، اختیار کرلے اور اس پر عمل کرے چاہے وہ کسی بڑے آدمی (عالم دین اور بزرگ) سے سنے اور چاہے کسی معمولی آدمی سے یہ نہیں کہ ایسے بے حیثیت آدمی کی کیا قبول کروں۔ چنانچہ بعض عارفین سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: اگر کسی شخص نے کوئی بات حضرت بایزید بسطامیؒ (جیسے جلیل القدر بزرگ اور عارف و فاضل) سے سنی اور اس کو قبول کرلیا لیکن اس نے جب وہی بات اس کنیز اور باندی کی زبان سے سنی اور اس کو قابل اعتناء و قبول نہیں جانا تو وہ شخص متکبر ہوگا۔ (مظاہر حق جدید جلد اول صفحہ ۲۷۳-۲۷۴)

یہ دولت کسے ملتی ہے

حکمت کی دولت سے اللہ جس کو نوازنا چاہتا ہے نوازتا ہے لیکن یہ دولت دراصل اور صرف رضائے الٰہی کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے کلام سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حکمت زاہدوں اور لایعنی باتوں سے بچنے والوں کو بطور خاص ودیعت کی جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوخلاد رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں کہ جب تم کسی بندے کو دیکھو کہ اسے دنیا سے بے رغبتی اور کم گوئی کی صفت عطا کی گئی ہے تو تم اس سے اپنی قربت بڑھاؤ، کیوں کہ ایسے شخص کو حکمت و دانائی سے نوازا جاتا ہے۔

مذکورہ حدیث سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ جس کے اندر یہ دو خوبیاں ہوتی ہیں یعنی زہد و قناعت اور کم گوئی اس سے تعلق جوڑنا چاہیے اس کی مجلس میں شریک ہونا چاہیے اور اس سے اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہیے کیوں کہ ایسے انسان کو من جانب اللہ حکمت کی عظیم دولت سے سرفراز کیا جاتا ہے، اس کا کوئی قدم دانستہ طور پر شریعت کے خلاف نہیں اٹھتا، اس کی گفتگو حکمت و دانائی سے لبریز ہوتی ہے، اور اس کے قول و فعل سے راہ حق کا متلاشی اپنے مقصد کو پانے میں کامیاب ہوتا ہے، حکمت کی عظمت کو سمجھنے کے لئے وہ آیت مبارکہ کافی ہے جس میں حکمت کو خیر کثیر سے تعبیر کیا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے: ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا (البقرۃ) (ترجمہ) جس کو حکمت دے دی گئی اس کو بڑی خوبیوں سے آراستہ کردیا گیا۔

حکمت کی تعریف و تشریح اہل علم کے نزدیک

حکمت کی تعریف و تشریح اہل علم کے نزدیک: حکمت کی تعریف و تشریح کرتے ہوئے علماء لکھتے ہیں۔ حکمت انسانی عقل و شعور میں پائے جانے والے اس جذبہ کو کہتے ہیں جس کی بنیاد پر بندہ اللہ کے ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق بھی ادا کرتا رہتا ہے، اور زندگی کے ہر گوشے میں شریعت مطہرہ کی پابندی کو لازم پکڑتا ہے، جس کو دیکھ کر اور جس کی باتوں کو سن کر لوگ اپنی کمیوں پر واقف ہوتے ہیں، ظاہری عیوب ہوں یا باطنی بیماریاں، عبادات میں پائی جانے والی کاہلی سستی ہو یا معاملات کی کوتاہیاں، اس کے دانش مندانہ بیانات اور حکمت سے لبریز ملفوظات سے انسان ہر طرح کی کمیوں پر متنبہ ہوتا ہے اور ان کو دور کرنے کی کوشش

میں لگ جاتا ہے، ایسے شخص کو صاحب حکمت وبصیرت کہا جاتا ہے جس کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کی ہر عقل مند کو کوشش کرنی چاہیے۔

حکمت کی تشریح کرتے ہوئے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

''حکمت کا لفظ بہت ہی بلیغ اور بڑی وسعتوں کا حامل ہے، دوسری زبان میں اس کا ترجمہ آسان نہیں ہے، اسی طرح ''موعظت'' بھی وسیع معانی پر حاوی لفظ ہے ''حسنہ'' کا لفظ بھی لامحدود معانی پر مشتمل ہے، قرآن نے اس آیت میں آزادی بھی دی ہے اور حد بندی بھی کی ہے، ایجاز واختصار بھی ہے اور بیان وشرح بھی۔

"ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة" اے پیغمبر اپنے پروردگار کے رستے کی طرف دانش اور نیک نصیحت سے بلاؤ۔

حکمت سے مراد عقل، دانائی سلیقہ، حسنِ تدبیر، سچی اور صحیح بات کو واضح کرکے دل میں اتارنے کا طریقہ، اس طرح کہ مداہنت یا موقع پرستی کا شائبہ نہ ہونے پائے، سیاست کا اس میں دخل نہ ہو، سیاست الگ چیز ہے اور حکمت وموعظت الگ ہے، اپنے عہد میں خدا کے محبوب ترین بندے موسیٰ علیہ السلام کو اس عہد کے خدا کے مغضوب ترین بندے ظالم، وجفا کار فرعون کے پاس جانے اور دعوت دینے کا حکم ملتا ہے، لیکن سلیقہ اور نرمی سے بات کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

اذهبا إلى فرعون إنه طغىٰ دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت نکل چکا ہے (طہ۴۳)

اس سرکش اور طاغی کے ساتھ بھی دعوت کا کیا طریقہ اختیار کرنا ہے؟ فقولا له قولا لينا (طہ۴۴) پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا۔

بات پکی اور سچی ہو، مگر انداز تکلم سلیقہ، نرمی، خوش آہنگی کا ہو: لعله يتذكر او يخشى (طہ۴۴) شاید وہ (برغبت) نصیحت قبول کرلے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جائے۔

اگر بھلی بات کے کہنے کا انداز بری طرح ہو تو وہ کارآمد ثابت نہیں ہوتا شاعر نے سچ کہا ہے ؎

کہتے ہیں وہ بھلے کی ولیکن بری طرح

بھلی بات کو بھلی طرح کہنا ہی حسنِ سلیقہ اور حکمت ہے، اگر مخاطب سے سوال وجواب بھی کرنا پڑے تو اس میں بھی سلیقہ ہونا چاہیے، مناظرہ اور مجادلہ کے موقع پر بھی اس کی ہدایت ہوئی۔

"وجادلهم بالتي هی أحسن"

اوران کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث کیجئے۔

تاکہ سننے والے اور دیکھنے والے داعی کے طریقۂ استدلال سے متاثر ہوں چاہے مخاطب پر اثر نہ ہو، اگر طریقۂ بحث ومجادلہ احسن طریقہ پر ہوگا تو مخاطب عقل سلیم اور نیک فطرت کی بنا پر خود متاثر ہوگا، اگر ایسا نہ ہوا تو بھی حاضرین و سامعین پر حسنِ مجادلہ کا ضرور اثر پڑے گا، یہی حقیقت آیت:

ان ابراهيم كان امة قانتا لله حنيفا ولم يك من المشركين (النحل ۱۲۰) (ترجمہ: بیشک ابراہیم بڑے مقتدا تھے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے بالکل ایک طرف کے ہو رہے تھے اور وہ شرک کرنے والوں میں نہ تھے)۔ سے بھی واضح ہوتی ہے۔ ان کو اس طریقۂ استدلال، سلیقہ حکمت و موعظت اور احسنِ مجادلہ کے باوجود حنيفا مسلما وكان من المشركين طریق مستقیم والے یعنی صاحب اسلام (آلِ عمران ۶۷) تھے اور مشرکین میں سے بھی نہ تھے۔

کا خطاب عطا فرمایا گیا، اس لئے کہ ان کو دعوت میں حکمت تھی مداہنت نہ تھی، نیت تھی، سیاست نہ تھی، لہذا ایک مومن کو بھی یہ طرزِ تبلیغ اختیار کرنا لازم ہے، عقائد کی اصلاح کے لئے بھی "ادع إلی سبیل ربك بالحكمة" طریق کار ہی مفید ہے، بات کتنی ہی ضروری اور لازمی ہو، داعی کے سامنے مقصد یہ ہونا چاہیے کہ مریض کا علاج کرنا ہے۔ اس میں پیار، نرمی اور محبت ہوسکتی ہے، درشتی، تیزی وتندی کی وجہ سے مریض تجربہ کار مشہور ڈاکٹر اور حکیم کے پاس جانے سے بھی ڈرتا ہے، علاج ومعالجہ کی بات ہی الگ ہے۔ امت کو پیغام ملتا ہے۔

لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤوف الرحیم (التوبہ ۱۲۸) اے لوگو! تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمہارے منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمان داروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور مہربان) ہیں''۔ (قرآنی افادات ج ارص ۸۳-۸۵)

کیا ھماری دعوت و تبلیغ حکیمانه ھے؟

الغرض حکمت کے ساتھ اُحکام الٰہی پر عمل کرنے سے انسان کو دین اور دنیا میں سر بلندی حاصل ہوتی ہے، کون سا عمل کس وقت کرنا چاہیے اور کس وقت نہیں۔ کون سی بات کس وقت کہنا چاہیے اور کس وقت نہیں اس کو سمجھ لینا ہی حکمت سے تعبیر ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ بات کہتے وقت یا کوئی عمل کرنے سے پہلے اس عمل یا بات کی افادیت یا اس کے نقصان پر غور نہیں کرتے اور عمل کر ڈالتے ہیں یا اپنی بات کہہ دیتے ہیں۔ پھر جب اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

ہمارے اسلاف نے جب دین اسلام کا پرچم بلند کیا اور اسلامی تعلیمات سے دنیاوالوں کو روشناس کرایا اس وقت مسلمان فرقوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے۔ بس سیدھے سچے مسلمان تھے۔ انہوں نے حکمت اور دانائی کے ساتھ اسلام کا پیغام لوگوں کے سامنے اس طرح رکھا کہ وہ پیغام ان کے دلوں میں اتر تا چلا گیا اور وہ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ یہ اللہ کا پیغام تھا اور اس کو پہونچانے والے حکمت کے ساتھ اپنا کام کرتے گئے۔

آج کی صورت حال بالکل مختلف ہے۔ آج ہم اسلام کے بجائے اپنے فرقوں کا پیغام پہونچانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہر گروہ اس بات پر مصر ہے کہ اس گروہ کا پیغام ہی اسلام کا درست پیغام ہے۔ نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی بات کرنے والے مختلف گروہ سب ملا کر صرف دس فیصد مسلمان ہیں اور خود کو مسلمان کہلانے والے ان دس فیصد لوگوں کی بات سن لینے کے لئے بھی یہ ۹۰٪ لوگ تیار نہیں ہیں۔ کیا یہی ہماری حکمت ہے کیا یہی وہ بات ہے جس سے ہم سرخ رو ہو سکتے ہیں۔ کیا یہ ان مسلمانوں کا راستہ ہے جن کے ہم نام لیوا ہیں۔؟

یہ ایک غور کرنے والی بات ہے۔ سنجیدگی سے ایمان داری سے پوری نیک نیتی سے ٹھنڈے دل سے کہیں ہم خود تو اپنے کو دھوکہ نہیں دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اتنی روشنی، شعور عقل اور اتنی حکمت عطا فرمائیں کہ ہم صحیح راستے پر چلنے اور دوسروں کو چلانے کے لئے صحیح حکمت کا دامن پکڑ سکیں۔

☆☆☆

شخصیات

ڈاکٹر محمود احمد غازی-ایک مطالعہ

محمد طارق ندوی رامپوری

آپ کو پھول نظر آجائیں گے خوبصورت اور خوشبو دار پھولوں کا ملنا بھی کوئی بعید نہیں، لیکن رنگارنگ، خوبصورت و خوشبودار پھولوں کا گلدستہ ملے، یہ ذرا مشکل ہے، ستاروں کا آپ ضرور نظارہ کرلیں گے، لیکن کہکشاؤں کا دیکھنا جدو جہد کا طالب ہے۔

مشرق کی زیارت کرلیں، مغرب کی سیر کرلیں، لیکن ان دونوں کی یکجائی خال خال ہی نظر آئے گی، کسی شخصیت کا دیدار کریں، اس کا مطالعہ کریں، لیکن شخصیتوں کے مجموعہ سے ملاقات واستفادہ آپ کی خوش قسمتی کی دلیل ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی گل نہیں گلزار تھے، علمی ستاروں کی کہکشاں تھے، مشرقی ومغربی علم وفنون کے ماہر تھے، قدیم و جدید علوم میں گہری دستگاہ رکھتے تھے، بھرپور ذہانت، عبقری دماغ، غیر معمولی علیمت کے مالک تھے، غرور وتکبر اور فکری کج ریوں سے کوسوں دور، عاجزی متانت، اعتدال اور فکری سلامتی کی دولت سے مالا مال تھے،

ڈاکٹر محمود احمد غازی مدرسہ سے فارغ التحصیل تھے، اور مدرسہ کے کردار پر ہمیشہ نازاں اور اس کی افادیت کے سدا قائل رہے، لیکن ساتھ ہی وہ مدارس کو دور جدید کی رہنمائی کے لیے اکساتے رہے، اور اس کے لیے اپنی آراء وتجاویز بڑے جچے تلے انداز میں دیتے رہے، ان کی زندگی کا اکثر حصہ یونیورسٹیوں اور اس کے متعلق افراد کے درمیان گذرا، لیکن ٹھیٹھ اسلامی مزاج کو انہوں نے اپنے سینے سے لگائے رکھا، اور اسلام پر خود اعتمادی کے درس ان کو گھول کر پلاتے رہے، اور اسلام بیزاری کی فضا میں ایک بڑے طبقہ کو علوم اسلامیہ کا حامل اور اس پر فخر کرنے والا بنادیا، انہوں نے شرقی علوم پر دسترس حاصل کی، ان کی صبحیں اور شامیں انہی علوم کے حامل افراد کے درمیان گذریں، لیکن وہ مغربی علوم کی نافعیت کے بھی قائل رہے، اور مستشرقین کے کارناموں کو سراہتے رہے، مغربی زبانوں پر کمانڈ حاصل کی، اور مغربی علوم کی گہرائی میں اترے، مستشرقین سے دوستانہ روابط بھی رکھے، لیکن وہ مغربی علوم کے ناقد بھی رہے، اور اس کی قباحتوں کو اجاگر بھی کیا، اور مستشرقین کی تعصب پر مبنی زہریلی تحریروں سے امت کو خبردار بھی کیا، وہ مسجد کے خطیب بھی رہے اور بین الاقوامی یونیورسٹی کے صدر بھی بنے، وہ ماضی سے تسلسل برقرار رکھنے کے لئے

تقلید کو لازمی قرار دیتے تھے، تو مستقبل کی نقشہ کشی کے لئے اجتہاد کو ضروری سمجھتے تھے، وہ ایک طرف علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو حدیث کا شہنشاہ بتاتے تھے تو دوسری طرف تحفۃ الأحوذی کو ترمذی کی سب سے بہتر شرح گردانتے تھے، دانشوروں نے ان کو اپنی صف کا فرد سمجھا لیکن ساتھ ہی ان کو ایک سے زاید خانقاہی سلسلوں سے اجازت وخلافت حاصل تھی، ان کا دماغ امت کی برتری کے لئے کوشاں تھا، اور زبان تلاوتِ قرآن سے تر رہتی تھی، ان کو حکومت اسلامیہ کے قیام کی تمنا وخواہش تھی، اور اس کے لئے انہوں نے کچھ بامعنی کوشش بھی کی، لیکن اس سوچ کے ساتھ کہ یہ مقصود لذاتہ نہیں مقصود لغیرہ ہے، انہوں نے ملک کے سربراہوں سے قریب رہ کر اسلام کی پاسبانی کرائی، یا کم از کم ان کی رہزنی سے امت کو بچایا، لیکن اس گلیارے کی گندگی سے اپنا سفید دامن اس طرح بچایا کہ ایک دھبہ تک آنے نہ دیا، جس طرح انہوں نے یہ بتایا کہ عالمی وملکی پیمانہ پر دینی وعلمی وثقافتی رہنمائی کے لیے امت کو کن علوم کے حامل افراد کی ضرورت ہے، تو ساتھ میں اس کی بھی وضاحت کی، کہ عام طبقہ کی رہبری کے لئے گاؤں اور محلوں کی مساجد کے ائمہ میں کن صلاحیتوں کا ہونا ناگزیر ہے، وہ اونچے سے اونچے عہدوں اور مناصب پر فائز ہوتے رہے، لیکن معاملات میں ایک خانقاہی حقیقی مُلّا کا رول ادا کیا، وہ کئی زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے، لیکن ان کی اردو وعربی میں انگریزی کی ملاوٹ نہیں تھی، انہوں نے زندگی کے لمحات سے با معنی اور بامقصد چیزوں کو نچوڑا اور اس کی افادیت عام کرنے کی بھرپور کوشش کی، انہوں نے حیات مستعار کے ایک ایک لمحے کا حساب رکھا، اور ایسی بھرپور متحرک بامقصد اور مصروف زندگی گذاری جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

خاندانی سلسلہ اور پیدائش

ڈاکٹر محمود احمد غازی کا اصلی وطن اور خاندانی سلسلہ تھانہ بھون کے ممتاز فاروقی خاندان سے ہے، اور نانیہالی خاندان کا تعلق کاندھلہ (مظفرنگر) کے معروف صدیقی خاندان سے ہے، ڈاکٹر محمود احمد غازی ۱۸ ستمبر ۱۹۵۰ کو دہلی میں پیدا ہوئے، والد ماجد حافظ محمد احمد فاروقی دہلی میں پاکستان ہائی کمیشن میں ملازم تھے، ۱۹۵۴ء حافظ محمد احمد صاحب اپنے بہت سے اعزہ و اقرباء کے ساتھ وطن کو خیرباد کہہ کر کراچی میں منتقل ہوئے، اور وہیں سرکاری دفتر میں تقرر ہوگیا، والدین نے محلے کے مدرسے میں مروج اسلامی طرز پر تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا، اور طعن و تشنیع کرنے والوں کے اس طرح کے جملوں کو اگر آپ کے پاس اسکول کی فیس نہیں ہے تو ہم دینے کو تیار ہیں، بالکل خاطر میں نہیں لائے، لکنت ہونے کے باوجود آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا، پھر عربی تعلیم کے لیے مولانا یوسف بنوری صاحب کے مدرسے میں داخل ہوگئے، وہاں مولانا بنوری سے بھی تلمذ کی سعادت نصیب ہوئی، مولانا عبدالرشید نعمانی سے بھی کچھ کتابیں پڑھنے کا موقع ملا، غازی صاحب نے کچھ مدت مدرسہ ٹنڈوالایار میں پڑھا، یہاں مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا بدر عالم میرٹھی کے دروس سے استفادہ کیا، یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ۱۹۶۴ میں والد صاحب سرکاری ملازمت کے پیش نظر اسلام آباد منتقل ہوگئے، چنانچہ درس نظامی کی تکمیل کے لیے راولپنڈی میں شیخ القرآن مولانا غلام احمد خاں صاحب کے مدرسہ میں داخلہ لیا، اور دورۂ حدیث پڑھا، پہلی مرتبہ آپ کی درخواست پر دورۂ حدیث ہی میں ہوا، یہاں مولانا عبدالشکور

کامل پوری صاحب سے سنن ابی داؤد اور موطا امام مالک پڑھیں، مولانا عبدالرحمٰن المینوی سے بخاری کا درس لیا، اسی دوران پرائیویٹ طور پر میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کا بھی امتحان دے دیا،

تدریسی خدمات

غازی صاحب جب مدرسہ سے فارغ ہوئے تھے تو فارسی کی اچھی شد بد پیدا کرلی تھی، اور عربی زبان سے ایک خاص لگاؤ ہونے کی وجہ سے اچھی واقفیت حاصل ہوگئی تھی۔ والد صاحب کے مشورے سے ایک اسلامک اسکول ''مدرسہ ملیہ اسلامیہ'' میں تدریسی خدمات دینی شروع کردیں، چھٹی کے اوقات میں علمی تشنگی کی سیرابی کے لئے ادارہ تحقیقات اسلامیہ کی لائبریری چلے جاتے، ایک مرتبہ غازی صاحب نے لائبریری میں ایک صاحب کو دیکھا، کہ بڑا نفیس لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں، سر پر عمدہ قسم کا عمامہ ہے، اور ان کی ''چال ڈھال سے ان کے عربی ہونے کا پتا چل رہا تھا، غازی صاحب کو عربی میں بات چیت کرنے کا شوق تھا، ان کے پاس چلے گئے، عربی میں بات چیت شروع کردی، ان کے استفسار پر غازی صاحب نے اپنا تعارف کرایا تھا غازی صاحب کے لہجے سے بہت خوش ہوئے، معلوم کیا، کیا تم فارسی جانتے ہو؟ جواباً غازی صاحب نے کہا کہ ہاں جانتا ہوں، اور اس کا کچھ ذوق بھی ہے، پھر معلوم کیا، کلام اقبال پڑھا ہے؟۔ اس وقت غازی صاحب اردو اور فارسی میں کلام اقبال کے حافظ تھے، اور یہ حافظہ ان کا آخری عمر تک رہا ہے، نوے فیصد اشعار ان کو ازبر تھے، عرض کیا، کلام اقبال بہت پڑھا ہے، پھر ارمغان حجاز سے کچھ اشعار سنے، اور کچھ کا عربی میں ترجمہ کرایا، بہت خوش ہوئے، پھر اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں شیخ صاوی علی شعلان ہوں، مصر سے میرا تعلق ہے، کلام اقبال کو عربی میں منظوم ترجمہ کرنا چاہتا ہوں، تو کیا تم میرا تعاون کرسکو گے، غازی صاحب نے فوراً حامی بھرلی، پوچھا کہ کیا کرتے ہو، غازی صاحب نے کہا مدرسہ میں پڑھاتا ہوں، فوراً کہا پھر مدرسہ کا کیا کروگے، غازی صاحب نے جواباً کہا چھوڑ دوں گا، شیخ شعلان کو حیرت بھی ہوئی اور شک بھی، لیکن آنے والے نے وقت ان کے شک اور حیرت کو دور کردیا، شیخ کے ساتھ غازی صاحب کو ایک سال مکمل کام کرنے کا موقع ملا، نتیجہ یہ نکلا کہ فارسی میں پختگی آگئی، عربی میں تحریری وتقریری مضبوطی آگئی، کلام اقبال کو اک نئی تربیت کے ساتھ پڑھنے کا موقع ملا، مطالعہ میں وسعت ہوئی مغربی افکار سے واقفیت ہوئی، دیگر ادباء کے کلام سے شناسائی ہوئی، اور لائبریری میں غازی صاحب کے حوالے سے اچھا تاثر قائم ہوگیا، اور پھر بہت جلد ہی ادارۂ تحقیقات اسلامیہ سے منسلک ہونے کی دعوت دی گئی، آپ نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اس کو قبول کرلیا، یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے، اور پھر آپ نے اسی دوران پرویئویٹ طور پر ایم اے بھی کیا، اور Phd بھی مکمل کرلی۔

دیگر زبانوں میں مہارت

غازی صاحب نے ادارۂ تحقیقات اسلامیہ میں ریڈر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کردیا، لیکن ہمیشہ طالب علمانہ مزاج برقرار رہا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس دوران غازی صاحب کی انگریزی بہت مضبوط ہوگئی، جرمن اتنی سیکھ لی کہ اس کے مصادر سے براہ راست استفادہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی،

فرنچ بھی اچھی خاصی آگئی، اسی وجہ سے اگر باہر کے وفود آتے تو ان کی ترجمانی کرنے کی ذمہ داری غازی صاحب کے سپرد کی جاتی، ۱۹۷۵ء میں امام حرم پاکستان تشریف لائے، تو ترجمانی کے فرائض اتنے بہتر انداز سے ادا کیے کہ امام حرم کو کہنا پڑا، آپ کی ترجمانی تو میری اصل سے زیادہ موثر نظر آرہی ہے، بہت مرتبہ ایسا ہوا کہ جنرل ضیاء الحق نے غازی صاحب کو اپنا عربی ترجمان بنایا، اور پھر اسی تعلق کی وجہ سے غازی صاحب جنرل ضیاء الحق کے دینی معاملات میں مشیر کار بن گئے، اور پھر آپ نے جنرل صاحب سے حکومتی سطح پر متعدد دینی وعلمی کام کروائے۔

آپ کی عربی دانی وعلمی لیاقت کو دیکھتے ہوئے ۱۹۸۱ء میں مشہور سہ ماہی مجلّہ ''الدراسات الاسلامیہ'' کی ادارت کے فرائض آپ کو سونپ دیے گئے، اس مجلّہ میں آپ کی صلاحیتوں کے جوہر خوب چمکے، اور پھر المجمع العلمی العربی دمشق کی رکنیت کے اعزاز سے نوازے گئے۔

آپ کی متنوع صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۹۸۴ء میں ایک علمی وتحقیقی سہ ماہی مجلّہ فکر ونظر کے مدیر ہونے کا شرف آپ کو بخشا گیا،

مسئلہ ختم نبوت کی طرف توجہ

اسی زمانہ میں ساؤتھ افریقہ کی سپریم کورٹ میں ختم نبوت کا مسئلہ زیر بحث آیا اس کیس کے لئے مختلف وفود گئے تھے، پہلا وفد ۱۹۸۳ء کو گیا تھا، اس میں مولانا تقی عثمانی مدظلہ و دیگر حضرات تھے، دوسرا وفد نومبر ۱۹۸۴ء میں گیا، اس میں غازی صاحب شریک تھے، یہاں پر بھی شرکاء وفد نے غازی صاحب کو وکالت کے لئے پیش کردیا، پھر کیا تھا غازی صاحب کا بیان بزبان انگریزی پانچ ہفتوں تک جاری رہا، اور پانچ ہزار صفحات لکھے گئے، اس میں عدالت اور وکیلوں کے تمام سوالات اور اعتراضات کا مدلل جواب دیا، اور ختم نبوت کے بنیادی مسئلہ کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا۔

بین الاقوامی یونیورسٹی کی تاسیس میں حصہ: ''غازی جو پیہم دواں ہردم جواں ہے زندگی'' کے مصداق تھے، اس علمی وعملی سفر سے واپس آکر پھر متحرک ہوگئے، غازی صاحب نے اے کے بروہی صاحب کو مشورہ دیا کہ اسلامی قوانین کے حوالے سے ایک ادارہ شریعہ فیکلٹی کا قیام ہونا چاہیے، بروہی صاحب نے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے قائد اعظم یونیورسٹی میں اس کی بنا رکھ دی، لیکن یونیورسٹی کا ماحول شریعہ فیکلٹی کے مطابق نہیں تھا، اس لئے غازی صاحب نے تجویز پیش کی کہ پاکستان چونکہ ایک اسلامی ملک ہے، اس لیے یہاں بین الاقوامی یونیورسٹی ہوئی چاہیے اور یہ بھی کہا کہ جس طرح عالم اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی الازہر کا قیام بھی مسجد میں ہوا تھا، اسی طرح یہ یونیورسٹی بھی مسجد میں قائم کی جائے، چنانچہ عالم اسلام کی ایک منفرد عظیم الشان مسجد کی تعمیر ہوئی، اور اس کا شرف شاہ فیصل شہید کو جاتا ہے اسی لئے اس مسجد کا نام فیصل مسجد رکھا گیا، اور اس میں ایک اسلامک سینٹر بھی قائم کیا گیا۔

جون ۱۹۸۸ء بروز جمعہ اس مسجد کا افتتاح ہونا تھا، خطابت کون کرے؟ امامت جمعہ کا شرف کس کو حاصل ہو، نظریں اٹھیں، اور قرعہ فال غازی صاحب کے نام نکلا، اور پھر منبر رسول سے بھی ہر جمعہ کو فیض کا سلسلہ جاری ہوا، اور اسلامک سینٹر کے ڈائریکٹر بھی آپ ہی بنے۔

دعوۃ اکیڈمی سے وابستگی

۱۹۸۰ء میں جب ادارۂ تحقیقات اسلامیہ کو بین الاقوامی یونیورسٹی کا حصہ قرار دے دیا گیا، تو غازی صاحب یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے، ۱۹۸۳ء میں دعوہ اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا، اس کا اساسی نام اکیڈمی برائے تربیت ائمہ (Academy for training Imams) تھا، اور بنیادی طور پر ائمہ مساجد اور خطبا و اساتذہ کی تربیت کے لئے اس کا قیام ہوا تھا، اس میں تربیت ائمہ کا پہلا پروگرام ۱۹۸۵ء کے اواخر میں ہوا، اور اس کی تخطیط میں غازی صاحب نے بھر پور حصہ لیا، کورسز کی تقسیم کی، پھر غازی صاحب نے اسلام کے سیاسی نظام کے موضوع پر لیکچر دینے شروع کیے، ہفتہ میں ایک دو لکچر غازی صاحب کے ہوتے تھے، اور پھر ۱۹۸۸ء کو دعوہ اکیڈمی کے ڈائریکٹر جنرل کے منصب کے لیے یونیورسٹی نے غازی صاحب کو منتخب کرلیا، غازی صاحب کی قیادت میں دعوہ اکیڈمی نے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی، قسم قسم کے تربیتی پروگرام شروع ہوئے، آرمی آفیسرز کے لئے تربیتی پروگرام شروع ہوا، اساتذہ وادباء کے لئے ورکشاپ کا سلسلہ شروع ہوا، بچوں کے ادب کا شعبہ قائم ہوا۔ مطالعۂ تفسیر و مطالعہ حدیث مطالعۂ اسلام کے عنوان سے پروگراموں کا آغاز ہوا، انہی کے زمانہ میں چند سالوں کے اندر دعوہ اکیڈمی کی جانب سے خاص طور سے سندھی زبان میں اسلام کے ہر موضوع پر ضخیم اور موثر کتابیں شائع ہوکر سندھ کے علمی حلقوں میں اعزازی طور پر تقسیم ہوئیں، سویت یونین سے آزاد مسلم ریاستوں کے لیے ایک سو سے زائد کتابوں کے تراجم شائع کرکے وہاں بھیجے، بین الاقوامی خاص طور سے وسط ایشیاء کے ائمہ کی تربیت کے لئے پروگراموں کا سلسلہ شروع کیا۔

پاکستان میں سودی بنکاری سے نجات کے لئے جن لوگوں نے کام کیا، اور خصوصا جب معاملہ سپریم کورٹ کے اپیلٹ بنچ میں گیا، اور سپریم کورٹ کے فل بنچ نے اس مسئلے کا جائزہ لیا، تو اس میں غازی صاحب نے نمایاں کردار ادا کیا، قانون سازی لے کر عملی نفاذ تک دن رات محنت کی، لیکن اس کے باوجود بعد میں اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی، اس کا ذکر انہوں نے اپنی تقریر میں کچھ اس طرح کیا ہے:

''اسٹیٹ بینک کے ڈپٹی گورنر جناب صنعت اللہ صاحب کے دستخط سے ۱۰/جون ۱۹۸۴ء کو ایک سرکیولر جاری ہوا، جس کے مطابق یکم جولائی ۱۹۸۴ء سے تمام بینک اپنے کاروبار کو اسلامی بینکنگ میں تبدیل کرنا شروع کر دیں گے، اور یکم جولائی ۱۹۸۵ء سے مکمل طور سے اسلامی بینکاری شروع ہو جائے گی، پھر کسی کو غیر اسلامی بینکاری کی اجازت نہیں دی جائے گی، لیکن اس نئے نظام پر مکمل عمل درآمد کا آغاز ہونے سے پہلے مارچ ۱۹۸۵ء میں انتخاب ہوگئے، اور جمہوریت کی نیلم پری آگئی، لوگ اس سے بغل گیر ہوگئے، ہمارے علماء کرام اور اسلامی اور دینی جماعتوں کے ارکان بھی جمہوریت کی اس نیلم پری کے استقبال میں مگن ہوگئے، سب اہل دین، اہل جبہ و دستار اور حیاء اسلام کے علمبردار بھی تجدید کے علمبردار بھی سب اس اصل کام کو بھول گئے، اور جمہوریت کے احیاء میں تن من دھن سے مصروف ہوگیے، غالب نے کہا ہے نا ؎

آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

جب میں اس داستان کو بیان کرتا ہوں تو میرے دل میں بھی درد سوا ہو جاتا ہے، اس لیے میری زبان میں تھوڑی

سی تلخی آجاتی ہے۔

قوانین اسلام کے نفاذ کی کوشش

جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں قوانین میں اسلام کے حوالے سے جو بھی ترمیم ہوئی تھی، اور قوانین کو ایک حد تک اسلامی رنگ میں جو رنگا گیا تھا، اس سلسلہ میں غازی صاحب کی جدو جہد قابل رشک ہیں، مندرجہ ذیل واقعہ سے اس کا بخوبی اندازہ ہوگا، ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد الغزالی بیان کرتے ہیں:

''اسی طرح ایک زمانہ آیا جب کچھ اسلامی قوانین کا نفاذ ہورہا تھا، اسلامی نظریاتی کونسل میں اور شریعت کورٹ میں مسائل زیر بحث تھے۔ مرحوم ضیاء الحق صاحب اس میں کچھ پیش پیش تھے، بھائی صاحب کو اس میں کچھ حصہ لینے کا موقع ملا، تو بعض موقع پر لگتا تھا کہ شاید انہوں نے ساری عمر یہی کام کیا ہے، میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ کروں گا، ضیاء الحق نے جب جونیجو حکومت کو برخواست کیا، تو وہ یہ چاہتے تھے کہ ایک شریعت آرڈیننس نافذ کریں جس کا مقصد میڈرل شریعت کورٹ کے اختیار سماعت میں توسیع کرنا تھا، آپ کو یاد ہوگا کہ ۸۱ء میں فیڈرل شریعت کورٹ بنی تھی، تو اس کے ختیارات دو قسم کے تھے، ایک تو یہ کہ سیشن کورٹ میں جو حدود اور قصاص وغیرہ کے مقدمات کے فیصلے ہوتے ہیں، اس کے خلاف اپیل شریعت کورٹ سنے گی، اور اس کے بعد اپیل ہوگی سپریم کورٹ کی شریعت اپیلٹ بینچ میں، اس کا دوسرا اختیار جس کو Orignal Jurisdiction کہتے ہیں، یہ تھا کہ کوئی بھی شہری شریعت پٹیشن دائر کرسکتا ہے جس میں وہ پاکستان کے کسی بھی قانون کے جز کو چیلنج کرسکتا ہے کہ یہ قرآن وسنت سے متعارض ہے، لہذا اس کو کالعدم قرار دیا جائے، یا بدلا جائے، شروع میں وفاقی شرعی عدالت کے اختیار سماعت سے مالی قوانین، دستور اور پروسیجر کو مستثنی رکھا گیا تھا، بہت سے استثنائات تھے جن میں کچھ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوگئے ہیں، کیوں کہ وہ خاص وقت تک کے لیے تھے، ضیاء الحق صاحب چاہتے تھے کہ ایک شریعت اوڈیننس آئے، جس میں یہ استثناءات ختم کردیے جائیں، ان کی لیگل ٹیم میں اس وقت جسٹس ارشاد حسن خاں تھے، جو بعد میں چیف جسٹس ہوئے، اس وقت وہ لاء سکریٹری تھے، ان کے علاوہ عزیز منشی صاحب اٹارنی جنرل تھے، اور شریف الدین پیرزادہ بھی تھے، ان تینوں حضرات نے ضیاء الحق صاحب سے کہا کہ آپ کچھ نہیں کر سکتے، اس لیے کہ اگر آپ آرڈیننس لائیں گے، تو یہ دستور میں ترمیم ہے، اور دستور میں ترمیم پارلیمنٹ کے بغیر نہیں ہوسکتی، جسے آپ نے ڈس مس کردیا ہے آرڈیننس قانون ہوتا ہے جو چھ مہینے کے لئے ہوتا ہے، تا آنکہ پارلیمنٹ اس کو منظور کرے یا مسترد کرے، آرڈیننس کے ذریعہ قانون سازی تو ہوسکتی ہے، دستور سازی نہیں ہوسکتی نہ دستور میں ترمیم ہوسکتی ہے لہذا یہ کام نہیں ہوسکتا، ضیاء الحق اس پر بہت Frustrated ہوئے۔ ان دنوں ان پر اس خیال کا بہت غلبہ تھا کہ میں نے اب تک جو کیا ہے وہ کافی نہیں، ہمارے بھائی صاحب کی موجودگی میں ان تینوں آدمیوں نے ضیاء الحق صاحب سے کہا، جی یہ نہیں ہو سکتا، آپ جو چاہیں آرڈیننس میں لکھ دیں، لیکن وہ جو استثناء ہے کہ شریعت کورٹ مالی سے متعلق معاملات کو نہیں سن سکتی، پروسیجر کو نہیں سن سکتی، کانسٹی ٹیوشن کے خلاف کچھ نہیں سن سکتی، اس طرح ایک دو اور چیزیں ہیں، یہ استثناء ختم نہیں ہوسکتا، یہ

میٹنگ رات کے بارہ بجے تک چلتی رہی، ضیاء الحق صاحب بہت دیر تک کام کرنے کے عادی تھے، میٹنگ کے بعد بھائی صاحب تھکے ہارے گھر آئے، اور آ کر کہا کہ مجھے کچھ چائے یا کافی پلاؤ، مجھے کام کرنا ہے، اور کمرے میں بند ہو گئے، صبح کی نماز تک وہ دستور، دستور کی شرحیں اور اس سے متعلق کچھ اہم فیصلوں کا پلندہ جو وہ کہیں سے لائے تھے، پڑھتے رہے، ساری رات اسی میں لگے رہے، اور صبح کے قریب وہ اچھل پڑے اور انہوں نے مجھے بھی بتایا، انہیں بڑی خوشی ہوئی کہ کہیں ایک جگہ یہ لکھا ہوا مل گیا کہ کسی کورٹ کی جو اس ڈکشن وہ ہوگی جو اس دستور میں طے کر دی گئی، اور جس کی وضاحت فلاں فلاں جگہ کی گئی، اور آخر میں ایک چھوٹا سا جملہ یہ لکھا ہوا تھا کہ by low۔ تو انہوں نے کہا جب قانون کے ذریعہ کسی عدالت کی جورس ڈکشن ہو سکتی ہے، تو ارڈیننس جو ہوتا ہے وہ قانون کا متبادل ہوتا ہے اس لیے آرڈیننس سے بھی ہو سکتی ہے، چنانچہ اسی مقصد کے لئے آرڈیننس سے لایا جا سکتا ہے کہ شریعت کورٹ کے اختیارات پر قدغن کم کیے جائیں یا وسعت بات کریں، اگلے دن وہ لیس ہو کر ان کے سامنے پہونچ گئے، اب میٹنگ شروع ہوئی ضیاء صاحب نے شاید ان سے کہا تھا کہ آپ تیاری کر کے آیئے گا، انہوں نے ضیاء الحق کے سامنے بہت مدلل انداز میں یہ ساری بات رکھدی، تو ضیاء الحق صاحب اپنی لیگل ٹیم پہ بہت ناراض ہوئے، ان سب سے کہا، کیا میں نے تمہیں گھاس چرنے کے لئے بلایا ہے، تم لوگ اتنے دن سے مجھے دھوکہ دے رہے ہو، جھوٹ بول رہے ہو؟ جو کچھ کہہ سکتے تھے انہوں نے کہا، بہر حال وہ بات مانی گئی، اور آرڈیننس بن گیا، ضیاء الحق نے نافذ بھی کر دیا، لیکن اس کے بعد بے نظیر کی حکومت آ گئی۔

اس واقعہ سے ان کی جدو جہد، شوق لگن، لیاقت اور قانون پر مکمل گرفت کا پتا چلتا ہے، ضیاء صاحب سے قریبی تعلقات کا بھی اشارہ ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق شہید کی نماز جنازہ پڑھانے کی سعادت آپ ہی کے حصے میں آئی۔

عھدے اور مناصب

غازی صاحب کی محنت اور صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ۱۹۸۸ء کو شریعہ اپیلیٹ بینچ سپریم کورٹ آف پاکستان کا جج بنا دیا گیا اور پھر ۱۹۹۰ء میں اسلامی نظریات کونسل کے ممبر بنے۔

۱۹۹۱ء کو شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی کے سربراہی کے فرائض آپ کے سپرد کر دئے گئے۔

۱۹۹۴ء کو دعوہ اکیڈمی کی ذمہ داریوں سے فارغ کر کے یونیورسٹی کا نائب کو بنا دیا گیا، آپ کے دور انتظام میں یونیورسٹی نے کافی ترقی کی، اسلامی مزاج پروان چڑھا، پردہ اگر چہ لازمی نہیں تھا، لیکن پردہ کا ذوق خواتین میں پیدا ہوا، مسلسل علمی و دینی پروگرام کا سلسلہ شروع کیا گیا ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اور دیگر محققین سے استفادہ کے راستے نکالے گئے۔

پرویزی دور میں آپ کی سرگرمیاں

۱۹۹۹ء میں غازی صاحب پرویز مشرف کی تشکیل کردہ کو نیشنل سیکورٹی کا ممبر بنایا گیا، یہ کونسل وفاقی کابینہ سے بھی اوپر ایک ادارہ تھا، بعض بزرگان دین کو حیرانی بھی ہوئی اور افسوس بھی، لیکن غازی صاحب نے یہ عہدہ صرف اس لیے قبول کر لیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی خیر کا پہلو نکل آئے چنانچہ اس پس منظر ڈاکٹر حیراں خٹک غازی سے ہونے والی گفتگو تحریر فرماتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے غازی صاحب کے ساتھ دعوہ اکیڈمی اور

یونیورسٹی میں ایک عرصہ تک کام کیا ہے۔

''جس دن ان کے سیکورٹی کونسل کے ممبر کی حیثیت سے حلف اٹھانے کی خبر شائع ہوئی، تو میں مبارکباد دینے کے لیے ان کے آفس گیا، جب میں نے مبارکباد دی تو انہوں نے مسکرا کر وصول کی، اور زبان سے کچھ نہیں کہا، پھر کہنے لگے مجھے پیشکش تو چند دن پہلے ہی ہوئی تھی، لیکن میں نے احباب کے ساتھ مشورہ کی مہلت مانگی تھی، چنانچہ کئی دوستوں سے مشورہ کے بعد آج حلف اٹھا رہا ہوں اللہ شاید کوئی خیر کا کام مجھ سے کرائے، میں نے کہا کہ آپ فلاں فلاں کے درمیان بیٹھ کر اپنے خیر کے تصور کے مطابق کوئی کام کر سکیں گے؟ کہنے لگے نہ کر سکا تو چھوڑ کر آ جاؤں گا، اب میں نے چبھتا ہوا جملہ کہا، کہ لوگ کہتے ہیں جب حکومت تبدیل ہوتی ہے، تو ڈاکٹر صاحب اپنی شیروانی ڈرائی کلین کر لیتے ہیں، اس پر ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، اور کہا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے آج تک نہ کسی عہدے کی خواہش ظاہر کی، اور نہ ہی کسی عہدے کے لئے کسی کو درخواست کی ہے، میرا ایمان ہے کہ عزت وذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس کے لیے ایک انسان کو دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہونا چاہیے، پھر اپنے بریف کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، اگر اس میں پڑی ہوئی تحریریں آپ کو دکھا دوں، تو آپ پریشان ہو جائیں گے کہ آخر یہ شخص سکون کی نیند کیسے سوتا ہے، لیکن الحمدللہ ان چیزوں کی مجھے پروا نہیں ہے، کیوں کہ میرا ایمان ہے کہ عزت وذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

۲۰۰۰ء میں مشرف کی پہلی کابینہ میں غازی صاحب کو وفاقی حکومت میں وزارت برائے مذہبی امور کا قلمدان پیش کیا گیا، اور غازی صاحب نے اس قلمدان کو سنبھال لیا، اس پر علمی حلقوں میں اضطراب بھی ہوا، کیوں کہ ہر شخص یہ خیال کرتا تھا کہ غازی صاحب کی افتاد طبع اس عہدہ سے مطابقت نہیں رکھتی ہے، کہاں غازی صاحب اور کہاں دینداروں کو نظر بد سے دیکھنے والی یہ حکومت، لیکن اس کے باوجود وفاقی وزیر کی حیثیت سے اصلاح احوال کی بڑی کوشش کی، یہ الگ بات ہے کہ اکثر آپ کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی۔

وزارت کا عہد سنبھالتے ہی آپ نے یونیورسٹی کے ایڈیشنل فائنانس خورشید عالم صاحب کو بلا کر کہا، جب تک میں وزیر رہوں گا اس وقت تک نہ یونیورسٹی سے تنخواہ وصول کروں گا، اور نہ ہی دیگر مراعات سے استفادہ کروں گا۔ مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنا آئیڈیل سمجھنے والے صدر مشرف نے مدارس کو ختم کرنے یا ان کو حکومتی احکامات کے تابع بنانے کی بھرپور مہم چلا رکھی تھی، چنانچہ غازی صاحب نے بڑی حکمت ودانائی سے اس مہم کو ناکام بنا دیا، مدارس کے اصلاح کے پروگرام کے سلسلہ میں اس وقت کے وزیر داخلہ کے ساتھ کابینہ کے اجلاس میں تلخ کلامی بھی ہوئی، اسی طرح غازی صاحب کی شدید خواہش تھی کہ سپریم کورٹ کے اپیلیٹ بنچ کے ربا کے متعلق فیصلے کی روشنی میں پاکستان میں غیر سودی نظام معیشت رائج کیا جائے، اس سلسلہ میں غازی صاحب نے حتمی تاریخ کا اعلان بھی کیا، لیکن ڈیموکریسی اور سیکولر عناصر نے ان کی ایک نہ چلنے دی، اور حکومت نے اس فیصلے کو بالائے طاق رکھ دیا، صدر مشرف نے پاکستان میں ہوائی اڈے امریکی فوج کو دینے کی بات کی، تو غازی صاحب نے اس کی بھرپور مخالفت کی، اور کہا کہ یہ فیصلہ غلط ہوگا، جس کے نتائج خطرناک ہوں گے۔

بہرحال آمرانہ مزاج سے وہ ہم آہنگ نہ ہو سکے، اور جب

ان کو محسوس ہوا کہ جن خیر کے منصوبوں کو لے کر میں یہاں آیا تھا، ان پر عمل درآمد یہاں ممکن نہیں ہے، تو انہوں نے وزارت کو چھوڑنے کا ارادہ کرلیا، اس حوالے سے سید حمید الرحمٰن شاہ کی تحریر ملاحظہ فرمائیں:

''جب وہ وزیر بنے تو کچھ عرصہ کے لئے میل ملاپ کا سلسلہ بند ہو گیا، (وجہ یہی تھی کہ انہوں نے وزارت کا عہدہ کیوں قبول کیا ہے) اس دوران کئی مرتبہ پیغام بھی بھیجا، پھر ڈاکٹر صاحب نے میرے مرشد حضرت محمد حسین انہی سے رابطہ کرکے میرے اس رویہ کا شکوہ کیا اور مجھے یہ کہلا بھیجا، جس شخص کے نام اور کردار سے آپ کو نفرت ہے مجھے بھی اسی طرح نفرت ہے، بلکہ کئی گنا زیادہ کراہت ہے، میں محض یہ سوچ کر اس بدبخت کی کابینہ میں داخل ہوا تھا کہ کوئی صلاح واصلاح کا پہلو نکل آئے، مگر یہ میری بھول تھی، اب میں بہت جلد اس سے علیحدہ ہونے والا ہوں، عملاً کب کا فارغ ہو چکا ہوں، صرف کاغذی کارروائی باقی ہے، آپ جلد ہی ذرائع ابلاغ سے میرے مستعفی ہونے کی خبر سن لیں گے۔

اگست ۲۰۰۲ء میں کو آپ نے اس عہدے سے اپنے آپ کو علحدہ کرلیا۔

۲۰۰۴ء میں بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد کی کرسئ صدارت پر جلوہ افروز ہوئے، ۱۹۸۵ء میں جب سے یونیورسٹی بنی تھی پہلے وہ پاکستانی تھے جو صدر کے عہدے پر فائز ہوئے، آپ نے اپنے زمانہ صدارت میں جس طرح طلبہ واساتذہ کو نظم ونسق کا پابند بنایا، اور ایک مثالی ماحول پیدا کیا وہ قابل رشک ہی نہیں لائق تقلید ہے۔ آپ کا یہ دور کلیۃ الشریعہ کے لئے بڑا مفید رہا، اسی دور میں کلیہ الشریعہ کے طلبہ کے لئے خصوصی کمپیوٹر لائبریری بنائی گئی، دوسری طرف شعبۂ قانون نے ایل ایل ایم میں تین تخصصات انٹرنیشنل لا، ٹریڈلا، کا رپوریٹ لا میں ڈگری کے پروگرام شروع کیے۔

صدارت کی مدت پوری کرنے کے بعد ۲۰۰۶ء کو کلیۃ الشریعہ والقانون میں پروفیسر شریعہ کے طور پر ذمہ داریاں سنبھالیں، لیکن وہ مکمل دو سال بھی نہیں کرنے پائے تھے کہ بقول شخصے صدارت کے بعد ان کا واسطہ بونوں سے پڑا، تو وہ خاموشی سے جامعہ قطر چلے گئے، کیوں کہ وہ لڑنے جھگڑنے والے آدمی نہیں تھے، قطر فاؤنڈیشن فیکلٹی آف اسلامک میں کام کر رہے تھے کہ ۲۶ ستمبر ۲۰۱۰ء کی رات میں دل کا دورہ پڑا، آپ نے عشاء کی نماز باجماعت ادا کی تھی، ایمرجنسی وارڈ میں داخل کیا گیا، جب صبح کی اذان ہوئی تو اپنے بھتیجے حمزہ غزالی سے کہا مجھے وضو کرنا ہے، چارپائی پر وضو کیا، اور چارپائی پر ہی صبح کی نماز ادا کی، جو کہ آپ کی زندگی کی آخری نماز ثابت ہوئی، نماز کے بعد جب دل کا درد بڑھنے لگا، تو آپ کے بھائی نے کہا مولانا تھانوی نے دردِ دل کے لئے جو دعا لکھی ہے، آپ کو یاد ہے، فرمایا وہی دعا پڑھ رہا ہوں، وہ دعا یہ ہے ألّف بين قلوبهم لو أنفقت ما في الأرض جميعا ما ألّفت بين قلوبهم ولكن الله ألّف بينهم إنه عزيز حكيم اس آیت کریمہ کا ورد کرتے ہوئے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

☆☆☆

شخصیات

سید حامد

''بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

ہندوستان کی ملت اسلامیہ نرگس بیمار کی مانند اپنی بے نوری پر روتی رہتی تھی، بڑی مشکل سے اس کے چمن میں ایک دیدہ ور پیدا ہوا تھا جس کا نام سید حامد تھا، ان کے آباء واجداد کا تعلق پٹنہ اور اس کے گردونواح ''نیورہ'' سے تھا، انیسویں صدی کے وسط میں ان کے دادا یا پردادا مراد آباد منتقل ہوگئے تھے، سید حامد صاحب کی پیدائش ۱۹۲۰ء کی ہے، سید حامد صاحب نے مسلسل شجر ملت کو نہال اور بارآور بنانے کی کوشش کی، ان کے پاس وہ دل تھا جو ملت کے حال زار پر روتا تھا، ان کے پاس وہ دماغ بھی تھا جو عقدۂ لاینحل کا حل ڈھونڈ کر لاتا تھا، ان کے پاس وہ چشم بصیرت تھی جو زوال واضمحلال کے اسباب کو دیکھ لیتی تھی، وہ ملت کے ایسے طبیب حاذق تھے جو مرض کی تشخیص بھی کرتے تھے اور نسخۂ شفا بھی پیش کرتے تھے۔ سید حامد کبھی صور اسرافیل بن کر قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہے اور کبھی بانگ درا بن کر قوم کو جادۂ پیا کرنے میں مشغول نظر آئے، وہ ملت اسلامیہ کے لئے سراپا وقف تھے، وہ ملت کی تعمیر کے حدی خواں تھے اور ترقی اور نہضت کے میر کارواں تھے، وہ ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، وہ سائنس، مینجمنٹ اور ٹکنالوجی یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے کوشاں رہے، وہ مفکر بھی تھے اور سراپا عمل بھی، وہ ملت کے سپاہی بھی تھے اور سپہ سالار بھی تھے، اور تنہا لشکر جرار بھی تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی تھے، معلم بھی تھے اور منتظم بھی تھے، ان کی شخصیت فکر ارجمند اور زبان ہوش مند کی ترجمان تھی۔

سید حامد صاحب کی شخصیت پرسوز، دردمند اور نہایت متوازن شخصیت تھی، وہ عصری تعلیم کے آدمی تھے اور مسلمانوں میں عصری تعلیم کو عام کرنے کے سب سے بڑے علمبردار تھے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی اور اخلاقی تربیت کے سب سے بڑے ترجمان تھے، خود وہ اقبال کے مردمومن کے پیکر تھے، اور نہایت خوش اوقات اور اوراد ونوافل کے پابند تھے۔ سرسید کے علی گڑھ کی نمائندہ شخصیتوں کی ایک مختصر فہرست بنائی جائے گی تو اس میں سید حامد کے نام اور کام کو نظر انداز کرنا مشکل ہوگا، ان کی بے شمار ایسی تحریریں ہیں جس میں انہوں نے عصری تعلیم کے ساتھ نئی نسلوں میں اسلامی ذہن وفکر کی حفاظت پر بہت زور دیا ہے، مسلمانوں کی کامرانی وفلاح کے لئے جس جامع قیادت کی ضرورت ہے وہ سید حامد کی شخصیت

میں پائی جاتی تھی، ان کے نزدیک صرف اقتصادی اور سائنسی ترقی کا حصول کافی نہیں، وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اسلام سے اور اسلامی تہذیب سے مسلمانوں میں والہانہ تعلق ہو۔ سید حامد صاحب کے مضامین کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''کرب آ گہی'' اور'' نگار خانۂ رقصاں'' اور'' شیرازہ'' میں ان کے خیالات اور افکار پورے طور پر نمایاں ہیں اور ان کی تحریروں اور نگارشات سے ان کی فکر و آ گہی اور دانشوری ، دور اندیشی اور ادبی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، وہ محسن ملت اور معمار قوم کہلانے کے پورے طور پر مستحق تھے۔

وہ اپنے مادر علمی مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور اسی زمانے میں انہوں نے تہذیب الأ خلاق کو دوبارہ نکالا اور اپنے خون دل میں ڈبو کر انہوں نے مؤثر و مفید مضامین لکھے، جب وہ آئی ایس آفیسر کی حیثیت سے ۱۹۸۰ء تک فرائض منصبی انجام دیتے رہے تو ان کی انتظامی قابلیت اور ان کی پرخلوص شخصیت سے حکومت کے ذمہ دار بہت متاثر رہے، انہوں نے حکیم عبد الحمید صاحب کے یونیورسٹی بنانے کے خواب کو عملی شکل دی، جس میں ان کی غیر معمولی بصیرت دانشمندی، حکومت کے ذمہ داروں سے بہتر تعلقات اور مراسم کا بڑا دخل تھا۔ وہ ہمدرد ایجوکیشنل سوسائٹی کے سکریٹری رہے۔ انہوں نے تعلیم آباد کو آباد کیا، انہوں نے ہمدرد پبلک اسکول قائم کیا۔ انہیں اس بات کی فکر تھی کہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ ہیں اور حکومت کے اعلی عہدوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں اس کے لئے انہوں نے ہمدرد اسٹڈی سنٹر قائم کیا جہاں انہوں نے ملت کے نوجوانوں کو مسابقتی امتحانات کے لئے تیار کیا اور اس ادارہ کے طفیل ملت کے بہت سے نونہال حکومت کے اعلی عہدوں تک پہنچے، انہوں نے پورے ملک میں تعلیمی کارواں کی قیادت کی اور مسلمانوں میں تعلیمی اخلاقی بیداری لانے کی کوشش کی۔ انہوں نے نیشن اینڈ دی ورلڈ کے نام سے انگریزی ماہنامہ جاری کیا۔

سید حامد صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کا اعتراف پورے ملک میں کیا گیا ہے، انہوں نے نازک حالات اور مشکل وقت میں ملت کی مخلصانہ رہنمائی کی ہے، اور ہمت باندھی ہے، ان کا احترام عصری دانش گاہوں میں بھی کیا جاتا ہے اور دینی اداروں میں بھی ، وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے اور ہمیشہ صبر وضبط اور حوصلہ کی تلقین کرتے تھے، ملت کو رہنمائی اور تعلیمی قیادت کے لئے ایسی ہی شخصیت کی ضرورت ہے جو دل دردمند اور فکر ارجمند رکھتی ہو اور اسی کے ساتھ ساتھ تفہیم اور ترسیل کے لئے زبان ہوش مند بھی رکھتی ہو، جو اردو کی طرح انگریزی پر بھی پوری قدرت رکھتی ہو، جو جدید تقاضوں سے پورے طور پر واقف ہو اور پوری ملت کو ترقی اور استحکام کے بلند مقام تک پہنچا سکتی ہو۔

سید حامد کی وفات ملت کا بہت بڑا نقصان ہے۔ سرسید، شبلی، اقبال، ابوالحسن علی ندوی، ابوالأ علی مودودی، محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین ، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عبد الماجد دریابادی بہادر یار جنگ جیسی شخصیتیں جس طرح سے آسانی سے منصۂ شہود پر نہیں آتی ہیں اور چشم فلک کو اس کے لئے مدتوں انتظار کرنا پڑتا ہے ،اسی طرح سے بلا تشبیہ سید حامد صاحب کی شخصیت بھی اس دیدہ ور کے مانند ہے جو چمن میں مشکل سے پیدا ہوتا ہے، اور جب پیدا ہوتا ہے تو ہر گوشہ چمن کو منور اور معطر کر دیتا ہے۔ ان کی بصیرت مندی اور دانش مندی کی وجہ سے انہیں سچر کمیٹی کا رکن بھی نامزد کیا گیا تھا، سید حامد کی شخصیت ایک عظیم شخصیت تھی اور عظیم شخصیت کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اس کا

دل بہت وسیع ہوتا ہے وہ کبھی مسلکی اور گروہی سیاست میں ملوث نہیں ہوتا ہے، وہ ہر جماعت کی خوبیوں کا قدرداں ہوتا ہے۔ مختلف النوع انسانوں سے محبت کرنے اور ان سے ہمدردی رکھنے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے اسی لئے وہ منصف مزاج ہوتا ہے، تعصب کا شکار نہیں ہوتا ہے ایسی ہی شخصیت ہوتی ہے جسے بالشتیوں کی دنیا کا '' گلیور'' کہا جاسکا ہے۔ یہ خصوصیات جب پیدا ہوتی ہیں تب ہی اس سے کسب نور کیا جاسکتا ہے اور اس سے فیضان حاصل کیا جاسکتا ہے، یہ ایک کسوٹی ہے جس پر انسان خود کو بھی پرکھ سکتا ہے اور دوسروں کا بھی احتساب کرسکتا ہے۔ تصوف سے عملی تعلق نے ان کی شخصیت میں ایک گداز پیدا کردیا تھا، وہ اذکار واوراد کے بہت پابند تھے۔ سید حامد عالم دین اور علوم اسلامیہ کے ماہر نہیں تھے لیکن امت کو ترقی اور عزت اور عظمت کے بام بلند تک پہنچانے کے جو راستے ہیں اور اس کے جو تقاضے ہیں ان کے ماہر ضرور تھے، جب کہ بہت سے علماء دین زمانہ سے بے خبری کی وجہ سے واقف نہیں ہوتے ہیں۔ سید حامد کو تاریخ کا اور روح مذہب کا گہرا شعور حاصل تھا، اخلاقی قدریں ان کی شخصیت میں پیوست تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی ترقی کا نظریہ ہی نہیں پیش کیا بلکہ عملی اقدامات بھی کئے اور ملت اسلامیہ کو بیدار کرنے میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، انہوں نے رابطہ کمیٹی قائم کی اور پورے ملک کے دورے کئے اور اس کے لئے انہوں نے وقت کے تلوں سے پورا تیل نچوڑ لیا، اور وقت کے کسی حصہ کو ضائع نہیں کیا۔ ان کا ہر کام ان کے خلوص، ان کی بصیرت اور ان کی دردمندی کا آئینہ دار ہے۔ اور اس لائق ہے کہ اس کو نمونہ بنایا جائے۔

اس وقت ملک کا جو نیا منظر نامہ ہے، جو نیا دشت غم ہے اور جو نیا پیچ وخم ہے، مذہب وتہذیب کے لٹ جانے کا جو خطرہ قدم قدم ہے اور صورت حال یہ ہے کہ کوئی راستہ بتانے والا نہیں اور کسی کے ہاتھ میں قندیل رہبانی نہیں۔ اور '' بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں''۔ ایسے تاریک اور پر خطر صحراء میں ہمیں سید حامد جیسے رہنما کی شدید ضرورت تھی، اس وقت حالات بہت مہیب اور دشوار گذار ہیں، غنیمت ہے کہ ایک ماہنامہ ''زندگی'' نے اور دوسرے ماہنامہ '' الفرقان'' نے موجودہ حالات میں رہنمائی کے تعلق سے خاص نمبر شائع کردیا ہے، ہدی پبلشرز حیدرآباد نے ۲۰۱۴ء کے الکشن اور مسلمانوں کی آئندہ کی حکمت عملی سے متعلق ایک کتابچہ چھاپ دیا ہے۔ سید حامد زمانے سے بیمار اور فریش تھے ورنہ ان کی کوئی فکر انگیز تحریر ضرور منظر عام پر آتی اور مسلمانوں کو وہ رہنمائی ملتی جس کی شدید ضرورت تھی۔

اکیسویں صدی کا سورج طلوع ہورہا تھا اس وقت عراق و افغانستان میں خاص طور پر مسلمانوں کی عزت واقبال کا سورج غروب ہورہا تھا، پورے عالم اسلام میں غم انگیز اور مایوس کن حالات تھے، راقم سطور کے قلم سے ایک کتاب '' حالات بدل سکتے ہیں'' شائع ہوئی تھی، اس کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لئے نظر انتخاب سید حامد صاحب پر پڑی تھی کہ وہ مفکر بھی تھے، مدبر بھی تھے دانشور بھی تھے۔ انہوں نے جو مقدمہ لکھا تھا وہ کتاب میں اہم اضافہ کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن حالات ابھی تک نہیں بدلے ہیں اور بحر غم کا کوئی ساحل ابھی تک نظر نہیں آیا ہے اور نہ ملت کی کشتی کا کوئی ناخدا۔ اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

☆☆☆

استدراک

حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت سے جن کتنی مدت تک بے خبر رہے؟

ایک تجزیہ

محمد فرید حبیب ندوی

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم الشان کتاب ہے جو رہتی دنیا تک کے لئے رہنمائی کا کام انجام دیتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اسکی حفاظت کی ذمہ داری خود لی ہے، اب قیامت تک کوئی اسمیں نہ کچھ کمی کرسکتا ہے نہ زیادتی۔ اسکے الفاظ ومعانی سب محفوظ ہیں۔

مگر اسکے مطالب کی دوقسمیں ہیں، ان میں کچھ تو ایسے ہیں جن میں انسان کو عقل استعمال کرنے کی اجازت نہیں، اور کچھ ایسے جن میں خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کو غور وفکر کرنے اور عقل استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے، ثانی الذکر قسم کی آیات کی تشریح وتعبیر اور تفسیر وتوضیح میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان کی دوقسمیں ہیں، کچھ روایات تو براہ راست حضور پاک ﷺ سے مروی ہیں، ان سے تو اختلاف کرنے کی کوئی مفسر جرأت نہیں کرسکتا بشرطیکہ وہ صحیح سند سے مروی ہوں۔ اور دوسری کچھ روایات صحابہ وتابعین سے منقول ہیں، قرآن پاک کی تفسیر کے وقت انہی کو ترجیح دی جائے گی بشرطیکہ روایت کے اعتبار سے وہ صحت کے معیار پر پوری اترتی ہوں۔

صحابہ وتابعین سے منقول ان روایات کی جس طرح روایت کے اعتبار سے دوقسمیں ہیں، صحیح اور ضعیف، اسی طرح مفہوم ومعنی کے اعتبار سے بھی دوقسمیں ہیں۔ کچھ کا تعلق عقائد واصول دین سے ہے جبکہ کچھ کا تعلق تاریخ وجغرافیہ، فروعیات اور طبعی حقائق سے ہے، ان دونوں قسموں میں سے پہلی دونوں قسموں کی روایات سے صرف نظر کرنے اور ان سے ہٹ کر کوئی لگ رائے قائم کرنے کی مفسرین نے اجازت نہیں دی ہے، مگر دوسری دونوں قسموں کی روایات سے الگ رائے قائم کرنا اور ان کو قبول کرنے نہ کرنے کے بارے اپنا کوئی نقطۂ نظر قائم کرنا انسانی عقل کا فطری حق ہے، اور مفسرین نے بھی اس سے منع نہیں کیا ہے، آیات کی تفسیر وتأویل میں اختلاف اسی حق کی وجہ سے ہے۔

اس طرح کی روایات جو تاریخ وجغرافیہ اور فروعیات سے متعلق ہوں یا وہ روایت کے اعتبار سے مضبوط نہ ہوں چاہے صحابہ وتابعین سے مروی ہوں یا قدیم مفسرین سے، بعد کے مفسر پر ان سے اختلاف نہ کرنے کی پابندی نہیں لگائی جاسکتی، اور اس اختلاف کو ''تفسیر بالرائے'' کے خانہ میں بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ مولانا ابو الکلام آزادؒ فرماتے ہیں ''تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں، تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل وبصیرت سے کام نہ لیا جائے، کیوں کہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس ومطالعہ ہی بے سود ہو جائے، اس (تفسیر بالرائے) سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لئے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے، بلکہ اس لئے کی جائے کہ ہماری

کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے،اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کردیا جاسکتا ہے۔مثلاً جب عقائد میں ردوکد شروع ہوئی تو مختلف مذاہب کلامیہ پیدا ہوگئے، ہر مذہب کے مناظر نے چاہا کہ اپنے مذہب پر نصوص قرآنیہ کو ڈھالے، وہ اسکی جستجو میں نہ تھے کہ قرآن کیا کہتا ہے بلکہ ساری کاوش اسکی تھی کہ کسی طرح اسے اپنے مذہب کا مؤید دکھلادیں، اس طرح کی تفسیر تفسیر بالرائے تھی"۔(ترجمان القرآن ص۴۴۔۴۵)

امام غزالیؒ فرماتے ہیں "إن في فهم معاني القرآن مجالاً رحباً ومتسعاً بالغاً، وإن المنقول من ظاهر التفسير ليس منتهى الإدراك فيه، فبطل أن يشرط السماع في التأويل، وجاز لكل واحد أن يستنبط من القرآن بقدر فهمه وعقله۔ (إحياء العلوم ۴/۶۳) یعنی قرآن فہمی کا ایک وسیع میدان ہے،اور اسکی جو تفسیر منقول ہے وہ اس میں حرف آخر نہیں،لہذا تفسیر وتأویل میں نقل وسماع کی شرط لگانا ہی باطل ہے، چنانچہ ہر ایک کو اس بات کا اختیار ہے کہ اپنی عقل وفہم کے اعتبار سے قرآن سے استنباط کرے۔

اسی وجہ سے ہر زمانہ میں علماء نے اپنے اپنے فہم کے اعتبار سے آیات کی تشریح وتفسیر میں قدیم مفسرین سے اختلاف کیا ہے،اس کی موٹی سی مثال یہ ہے کہ منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو بتائی جاتی تھی، مگر امام سیوطی نے اپنے فہم سے کام لے کر متقدمین کے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کیا، اور وہ صرف بیس اکیس آیتوں کے منسوخ ہونے کے قائل ہوئے، پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے امام سیوطی سے بھی اختلاف کیا اور صرف پانچ آیات کو منسوخ مانا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن میں غور وفکر کرنا اور اپنے فہم کے مطابق کوئی رائے قائم کرنا نہ صرف یہ کہ معیوب نہیں بلکہ مستحسن ہے، بس شرط یہ ہے کہ اس سے اسلام کے کسی اصول پر آنچ نہ آنے پائے۔

مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ لکھتے ہیں "البتہ اگر کسی مفسر نے ایک آیت کی ایسی تفسیر کردی ہے جو اس مسئلہ کی حقیقت کے خلاف پڑتی ہے تو بلا شبہ اس کے بیان کردہ معانی کو نظر انداز کردینا اور آیت قرآن کو اصل حقیقت کے مطابق ظاہر کرنا قرآن عزیز کا اپنا مطالبہ ہے، جو تعقل، تفکر اور تدبر کی بار بار دعوت سے ظاہر ہوتا ہے، أفلا تعقلون، أفلا تتدبرون، أفلا يتفكرون۔ لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ یہ بحث صرف ان ہی مسائل سے متعلق ہے جو تاریخی، جغرافی اور طبعی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں"۔(قصص القرآن ۴۹۔۵۰)

اس تفصیل سے دو باتیں واضح ہوگئیں، ایک تو یہ کہ کمزور تفسیری روایات سے الگ کوئی رائے قائم کرنا تفسیر بالرائے میں داخل نہیں، دوسرے یہ کہ سلف سے منقول وہ تفسیری روایات جن کا تعلق اصول دین واجماعی مسائل سے نہ ہو ان کو قبول کرنے نہ کرنے میں اپنی اپنی تحقیق کے مطابق کوئی نقطۂ نظر پیش کرنا ہر مفسر کا فطری حق ہے جو اس سے چھینا نہیں جاسکتا۔

اس پوری بحث کو سامنے رکھ کر ذرا انصاف سے سوچئے کہ اگر "فلما قضينا عليه الموت ما دلهم على موته إلا دآبة الأرض تأكل منسأته" کی تفسیر میں حضور پاک علیہ السلام سے اس سلسلہ میں کوئی روایت منقول نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کتنی مدت حالت موت میں رہے، اور ایک دو صحابہؓ سے ایسی روایت منقول ہے جس میں ایک سال کی مدت کا ذکر ہے، اس کی اسنادی حیثیت سے قطع نظر اگر کوئی شخص اپنی تحقیق کی روشنی میں اس ایک سال کی مدت کو قبول نہیں کرتا ہے تو آخر وہ دین کے کس جزء وکلیہ کا انکار کر رہا ہے جس کی بنیاد پر اسے گمراہ قرار دے دیا جائے اور اس کی بیان کردہ تفسیر کو تفسیر بالرائے کا طعنہ دیا جائے، اور پھر جبکہ اسکی اسنادی حیثیت اتنی مجروح ہو کہ محققین اسے اسرائیلی روایت قرار دے رہے ہوں اور روایت کے اعتبار سے اس پر ضعف

کا حکم لگا رہے ہوں تو بھی اس سے اختلاف کو اگر گمراہی قرار دیا جائے، تو آخر اس طرزِ فکر کو کیا نام دیا جائے!

اب رہی یہ بات کہ تمام مفسرین اسے نقل کرتے آئے ہیں تو اس سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہے کہ باوجود کوشش کے تفسیری ذخیرہ کو اسرائیلی روایات سے پوری طرح پاک نہیں کیا جاسکا، اور بہت سی روایات بلاتحقیق اس وجہ سے نقل ہوتی چلی آئیں کہ وہ کسی معتبر شخص کے حوالہ سے منقول تھیں، بقول مولانا آزادؒ کے ''اسرائیلیات (یعنی یہودیوں کے قصص وخرافات) کو ہمیشہ محققین نے چھانٹنا چاہا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان عناصر کے مخفی اثرات دور دور تک سرایت کرچکے تھے، اور وہ برابر جسم تفسیر میں پیوست رہے......چوتھی صدی ہجری کے بعد عام شاہراہ تقلید کی شاہراہ ہوگئی......اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل درنقل ہوتی چلی آئے، کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لئے تقلید سے الگ ہوکر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے۔(مقدمہ ترجمان القرآن)

اب اس طرح کی روایت کو جانچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کو روایت ودرایت کے معیار پر پرکھا جائے، جو دونوں معیاروں پر پوری اترے اسے قبول کیا جائے ورنہ نہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی روایت روایت کے معیار پر تو پوری اترے مگر درایت کے اصول کے مخالف ہو تو اس صورت میں بعض موقعوں پر روایت کو ترجیح ہوگی اور بعض موقعوں پر درایت کو، جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں، لیکن اگر کوئی روایت نہ تو روایت کے اصولوں پر پوری اترتی ہو اور نہ ہی درایت کے شرائط کے مطابق ہو تو ایسی صورت میں اس روایت سے ہٹ کر کوئی رائے قائم کرنا ناجائز نہیں ہوگا۔ موضوع بحث روایت اسی قسم کی ہے، اس سے پہلے کہ ہم اس کے بارے میں روایۃً ودرایۃً بحث کریں مناسب سمجھتے ہیں کہ علامہ شبلیؒ نے علامہ ابن جوزیؒ کے حوالہ سے درایت کے جو اصول بیان کئے ہیں ان میں سے چند پیش کردیں، علامہ شبلیؒ علامہ ابن جوزیؒ کی اصل عربی عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ''اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں۔

۱۔ جو روایت عقل کے خلاف ہو۔

۲۔ جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔

۳۔ محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔ (بقیہ سات صورتیں اور بھی ذکر کی ہیں جن کا ذکر طوالت کا سبب ہوگا۔ مقدمہ سیرۃ النبی ﷺ)

ان اصول سے اختلاف کی بھی گنجائش ہے، چنانچہ پہلے اصول پر بعض علماء نے چند قیدیں لگائی ہیں، عقلی اور نقلی دلائل میں تعارض کو رفع کرنے کے سلسلہ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک قول نقل کرنے کے بعد اسکی وضاحت کرتے ہوئے مفتی تقی عثمانی مد ظلہ فرماتے ہیں ''بعض ظنی دلائل دوسرے ظنی دلائل کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتے ہیں، مثلاً یہ بات بھی ظنی ہے کہ زمین حرکت کرتی ہے اور یہ بھی ظنی ہے کہ انسان سے پہلے دنیا میں ''نیانڈرتھل'' ( ) کے نام سے ایک مخلوق پائی جاتی تھی، لیکن ظاہر ہے کہ قوت کا جو درجہ پہلی بات کو حاصل ہے وہ دوسری بات کو حاصل نہیں، اسی طرح ایک ظنی نقلی دلیل وہ ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور تمام حدیث کی کتابوں میں موجود ہو، اور ایک وہ ہے جو صحیح سند کے ساتھ منقول ہے لیکن صحاح ستہ اور حدیث کی معروف ومتداول کتابوں میں نہیں پائی جاتی، ظاہر ہے کہ پہلی قسم دوسری قسم کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہے، اسی طرح ظنی دلائل میں درجات متفاوت ہوسکتے ہیں، اب اگر کوئی عقلی دلیلِ ظنی درجہ اول کی ہو اور نقلی دلیلِ ظنی درجہ دوم سوم کی تو

ایسی صورت میں ایک مجتہد عقلی دلیل کو نقلی دلیل پر ترجیح دے کر نقلی دلیل کی ایسی توجیہ کرسکتا ہے جو ظاہری الفاظ کے لحاظ سے نسبتاً بعید لیکن عقلی دلائل کے مطابق ہو''(علوم القرآن ۴۱۷)

ظاہر ہے کہ جب عقلی اور نقلی دلائل میں تعارض ہوجائے اور نقلی دلیل نہ صرف یہ کہ ظنی ہو بلکہ اسکے ساتھ ساتھ وہ ضعیف الروایۃ بھی ہوتو اس صورت میں نقلی دلیل پر عقلی دلیل کو ہی ترجیح دی جائے گی۔

ابن حجرؒ جیسے محدث جلیل نے نقلی دلائل کے ہوتے ہوئے بعض موقعوں پر عقلی دلائل کو استعمال کیا ہے،اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوجاتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ نقلی دلائل کے ہوتے ہوئے عقلی دلائل سے بالکل صرف نظر کیا جائے گا۔مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے الفاظ میں ''حافظ ابن حجر حدیث ابی ھریرۃؓ ''خلق اللہ آدم وطولہ ستون ذراعاً'' کے متعلق کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امم گزشتہ کے جو آثار ثمود کے دیار کی طرح مٹے ہوئے پائے جاتے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قدوقامت ترتیب سابق کے اقتضاء کے مطابق بہت زیادہ طویل نہیں تھے،حالانکہ ان کا زمانہ بھی بہت قدیم ہے،اور جو زمانہ قوم ثمود اور حضرت آدمؑ کے درمیان ہے وہ اس زمانہ سے کم ہے جو قوم ثمود اور امت مسلمہ کے شروع زمانہ کے درمیان ہے،اب تک مجھ کو اس اشکال کا حل نہیں معلوم ہوا۔(فتح الباری ۲/۲۸۲۔فہم قرآن ۱۷۸۔)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ نقلی دلائل کے ہوتے ہوئے عقل استعمال کرنے کی ممانعت عمومی نہیں ہے بلکہ اسکا مدار اس روایت کے معیار اور اس میں بیان کئے گئے مضمون پر ہے۔زیر بحث روایت نہ تو صحت کے معیار پر پوری اترتی ہے،نہ ہی وہ مرفوع ہے،اور نہ ہی اس میں بیان کیا گیا مضمون قطعی اور اس درجہ کا ہے جس کا انکار کلیات دین کے انکار کا موجب ہو،ان تمام کمزوریوں کے باوجود اس روایت پر اتنا اصرار کیوں؟

اس روایت کی اسنادی حیثیت پر بھی ایک نگاہ ڈالتے چلئے،ابن کثیرؒ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ''وقد ورد فی ذلك حدیث مرفوع غریب،وفی صحته نظر۔پھر حدیث ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں''ھکذا رواہ ابن ابی حاتم من حدیث ابراھیم بن طھمان به،وفی رفعه غرابة ونکارة،والأقرب أن یکون موقوفاً۔(ابن کثیر ۳/۶۹۳۔)اس سلسلہ میں ایک حدیث مرفوع وارد ہوئی ہے جو کہ غریب ہے،اور اسکی صحت محل نظر ہے،اسی طرح ابن ابی حاتم نے ابراہیم بن طھمان کے حوالہ سے نقل کیا ہے،مگر مرفوعاً تو وہ منکر اور غریب ہے۔اقرب یہ ہے کہ موقوف ہو، پھر اسی موقوف روایت کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ھیں"وھذا الأثر–واللہ أعلم–إنما ھو مما تلقی من علماء أھل الکتاب،وھی وقف لا یصدق منه إلا ما وافق الحق،ولا یکذب منھا إلا ما خالف الحق،والباقی لا یصدق ولا یکذب۔(۳/۶۹۴)یعنی یہ روایت علماء اہل کتاب سے لی گئی ہے۔

مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ لکھتے ہیں''حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق قرآن عزیز نے اسی قدر بتایا ہے،اس سے زائد تفصیل نہیں بیان کی،اور نہ اس کے مقصد تبلیغ کے پیش نظر اس کی کوئی ضرورت تھی،لہذا ہم کو ان تفصیلات میں کنج وکاؤ کی حاجت نہیں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کتنی مدت لاٹھی کے سہارے کھڑے رہے؟کس حالت میں کھڑے رہے؟......البتہ اسرائیلی روایات سے ماخوذ ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ......(پھر وہ پوری روایت ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں)غرض یہ اور اسی قسم کی روایات ہیں جو اسرائیلیات سے نقل ہوکر اس سلسلہ میں کتب تفاسیر میں بیان کی گئی ہیں،اور نقل کرنے کے بعد محققین نے واضح کردیا ہے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔(قصص القرآن ۲/۱۶۹)

ان تمام تفصیلات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس متنازع فیہ روایت کی کیا حیثیت ہے جس سے اختلاف پر اتنا واویلا مچایا

جارہاہے۔

اور پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ آیت کا اصل مقصود ومضمون جنوں کے علم غیب کی نفی ہے،اور یہ مقصود مدت کی کمی وزیادتی کی تعیین کے بغیر بھی پورا ہوتا ہے،اور اسی وجہ سے بقول مولانا سیوہاروی کے''ہم کو ان تفصیلات مین کنج وکاؤ کی حاجت نہیں کہ حضرت سلیمانؑ کتنی مدت لاٹھی کے سہارے کھڑے رہے۔''

جن دلائل کی بنیاد پر اس روایت سے اختلاف کرنے کی گنجائش ہے انکی تفصیل اوپر مذکور ہوچکی،ان کے بنیادی نکات حسب ذیل ہیں:

۱۔یہ روایت عقل کے خلاف ہے۔

۲۔عقلی دلائل کے مقابلہ میں اس کی اسنادی حیثیت نہایت کمزور ہے۔

۳۔یہ اسرائیلی روایت ہے جیسا کہ محققین نے لکھا ہے،اور اسرائیلی روایت کو قبول کرنے نہ کرنے کے سلسلہ میں''لاتصدق ولا تکذب'' کا اصول ذہن میں رہنا چاہئے،جس کی رو سے اس سے اختلاف کرنے والے کو گمراہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔بلکہ اسرائیلی روایت اگر واقعہ یا عقل کے خلاف ہو یا قرآن وحدیث کے خلاف ہوتو اسے رد ہی کر دینا چاہئے۔

۴۔ابن کثیر نے اسے منکر وغریب بتایا ہے۔

۵۔مولانا سیوہاروی نے بھی اسے اسرائیلی روایت قرار دیا ہے۔

۶۔اس کا تعلق اصول وکلیات دین سے نہیں کہ اس کے منکر کو گمراہ کہا جاسکے۔بلکہ یہ تاریخ سے متعلق ہے جس سے اختلاف کی پوری گنجائش موجود ہے۔

۷۔یہ روایت مرفوع بھی نہیں جیسا کہ ابن کثیر نے صراحت کی ہے۔

۸۔ایک سال کی مدت اسی روایت کے بیان کے مطابق ظن وتخمین پر مبنی ہے جیسا کہ علامہ آلوسی نے بھی لکھا ہے،لہذا اسے قطعیت کا درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

۹۔آیت کی یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے،یہاں یہ بات ذہن میں رہے بقول مولانا تقی امینیؒ کے کہ''ابن عباس کی عظمت کی وجہ سے جعل سازوں نے ان کے نام سے خوب فائدہ اٹھایا ہے،اسی لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابن عباسؓ کی روایت اگر چہ صحیح الاسناد ہے یہ کوئی ضروری نہیں کہ سچ مچ یہ ابن عباس ہی کی روایت ہے۔ہوسکتا کہ کسی کذاب نے روایت وضع کر کے ان کے نام سے بیان کردی ہو۔''اب خود اندازہ کرلیا جائے کہ جب صحیح الاسناد روایت کا یہ حال ہے تو پھر ضعیف ومنکر روایت کا کیا حال ہوگا!!

۱۰۔آیت سے مقصود جنوں کے علم غیب کی نفی ہے،انتقال کے بارے میں معلوم نہ ہونا،چاہے چند منٹ کے لئے ہو،علم غیب کی نفی کیلئے کافی ہے۔لہذا اچھوتی اور بے سروپا روایات کے سہارے عقل عام کا قتل عام کیوں کیا جائے۔

۱۱۔حضرت امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ تین موضوعات ایسے ہیں جن میں بے سروپا روایات بہت ہیں،تفسیر،مغازی اور ملاحم، امام شافعی سے منقول ہے کہ ابن عباسؓ سے صرف سو (۱۰۰) تفسیری روایات ثابت ہیں،اب غور فرمایئے کہ ۶۶۶۶ آیات کے بارے میں صرف سو روایات ہیں اور باقی اسرائیلیات موضوعات، اور بے سروپا روایات ہیں۔

آخری بات

بڑے ہی ادب کے ساتھ اہل علم حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر اتنا ہنگامہ نہ کیا جائے ، ہمیشہ وسعت ذہنی اور فکری اعتدال سے کام لیا جائے،دوسروں کے نقطۂ نظر کو برداشت کرنے کی عادت ڈالی جائے بشرطیکہ اس سے اسلامی اصولوں پر آنچ نہ آتی ہو،اور اس طرح کے اختلاف کو عام نہ کیا جائے کہ اس سے علماء کی شبیہ خراب ہوتی ہے،اس کے علاوہ بھی کرنے کے اور بہت سے کام ہیں۔اپنی صلاحیتوں کو اہم اور اونچے کاموں میں لگایا جائے،اور مل جل کر دین وملت کی خدمت کرنے کی فضا قائم کی جائے۔

☆☆☆

آخری صفحہ

دیکھنا پڑتا ھے انداز نگاہِ یار کو

حضرت قرہ صحابی رسول ہیں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں قبیلہ مزینہ کی ایک جماعت کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں، اور سارے لوگ آپ ﷺ پر ایمان لاتے ہیں، اس وقت حضور اکرم ﷺ کے پیراہن مبارک (قمیص مبارک) کے بٹن کھلے ہوئے تھے، قرہؓ کہتے ہیں کہ میں اپنا ہاتھ نبی کریم ﷺ کے کرتے کے اندر لے گیا اور مہر نبوت کو چھوا، عروہ بن عبداللہ جو حدیث کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے ہمیشہ معاویہ اور ان کے لڑکے کو اس حال میں پایا کہ ان کے بٹن کھلے رہتے تھے، جاڑے کے موسم میں بھی اور گرمی کے موسم میں بھی'' (متفق علیہ)

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کے طریقوں کی کتنی شدت کے ساتھ پابندی کرتے تھے، وہ منطق اور فلسفہ کی زبان نہیں جانتے تھے، انہیں تو صرف اس سے غرض تھی کہ ان کے محبوب کا طرز عمل کیا ہے۔

ورنہ وہ خوب جانتے تھے کہ آدمی کے بٹن کسی وقت کھلے رہتے ہیں اور کسی وقت بند رہتے ہیں، لیکن حضرت قرہ کی حاضری کے وقت اتفاق سے آپ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ بس یہ ادا اس عاشق رسول کی نگاہوں میں بس گئی اور ایسی بسی کہ وہ، ان کے لڑکے اور پوتے تادم حیات جاڑے اور گرمی کے موسم سے بے نیاز اپنے کرتے کے بٹن کھلے رکھتے، حالانکہ یہ ان کے لئے کوئی ضروری نہیں تھا مگر سچی محبت ہو جانے کے بعد محبوب کی، پیروی میں ضروری اور غیر ضروری کی تقسیم فضول ہوتی ہے، وہاں تو بس محبوب کا عمل، نمونہ اور انداز دیکھا جاتا ہے۔ بقول جگر مرادآبادی ؎

دیکھنا پڑتا ہے انداز نگاہ یار کو

مذکورہ حدیث رسول اور واقعہ کو سامنے رکھ کر ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ کیا ہمارے اندر شمہ برابر عشق رسول کی یہ کیفیت اور جھلک موجود ہے، کیا ہمارے اندر اللہ اور رسول کی سچی محبت اور الفت رچی بسی ہے۔ دعویٰ تو بہت ہے لیکن محبت محض دعوی کی چیز نہیں بلکہ کر کے دکھانے کی چیز ہے۔

کی محمد سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کہ کیا لوح وقلم تیرے ہیں

(م۔ق۔ن)

☆☆☆